جلد : 02

مصنف :

جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

تذکرۂ معاصرین

۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء میں وفات پانے والے
ادبار کے حالات اور کلام

۲

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

© مالک رام ۱۹۷۶ء

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار۔ دہلی ۶

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

تعداد۔ ۱۱۰۰ قیمت ۱۴ روپے بار اوّل ۱۹۷۶ء

(جمال پرنٹنگ پریس۔ دہلی)

پروفیسر مختارالدّین احمدؒ

کی نذر

تعارف

تذکرۂ معاصرین کی پہلی جلد ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ اس میں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کے پانچ برس کے اموات کا ذکر تھا۔ یہ دوسری جلد ان ادبا کے حالات کو محتوی ہے، جنھوں نے ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دوران میں رحلت کی۔ ان مرحومین کے حالات جمع کرنے میں بھی اسی طریقۂ کار پر عمل رہا ہے، جس کی طرف پہلی جلد کے شروع میں اشارہ کر چکا ہوں۔

جن اصحاب سے میرے ذاتی تعلقات لمبے عرصے تک رہے، یا جن کے پسماندگان اور احباب نے دستِ تعاون بڑھایا، آپ کو ان کے حالات مفصّل تر اور نسبتاً مکمّل ملینگے۔ میری دلی خواہش تو یہی رہی کہ سب کے حالات یکساں شرح و بسط سے مہیا ہو جائیں، لیکن اس کی تکمیل محض میری کوشش پر منحصر نہیں تھی، ہر جگہ ضروری تفصیلات نہ مل سکیں۔ مجبوراً، جو کچھ میسّر آ گیا، اسی پر صبر و شکر کرنا پڑا۔ پاکستان کے ادبا کے حالات جمع کرنے میں خاص طور پر دشواری پیش آئی۔ ایک زمانے سے وہاں کے احباب سے خط و کتابت کا رستہ بند ہے! یہاں ان اصحاب کے دواوین بھی نایاب ہیں، اور پاکِستان سے ان کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہیں، بلکہ وہاں بھی اب یہ آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ اسی لیے آپ کو ان اصحاب کے حالات میں بعض ایسی تفاصیل نہیں ملینگی، جن کے دینے کا دوسری جگہ التزام کیا گیا ہے۔ تاہم جو کچھ ہو گیا، یہ بھی بسا غنیمت ہے۔

میں نے یہ حالات ریزہ ریزہ کر کے جمع کیے ہیں۔ مرحومین کے خاندان کے لوگوں سے،

ان کے احباب سے، اخباروں، رسالوں سے، کتابوں سے ـــــ غرض کہاں تک گناؤں، خاصی لمبی فہرست ہے۔ تمتّع زہر گوشۂ یافتم۔ میرے نزدیک ہر جگہ حوالے دینے کی ضرورت نہیں۔ جو اصحاب اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں، میں ان پر بھی اعتراض نہیں کر سکتا۔ وہ ان کا طریقۂ کار ہے، یہ میرا۔ البتہ اگر کوئی صاحب کسی بات کا حوالہ طلب کریں، تو یہ بخوشی پیش بھی کر سکتا ہوں۔

میں ان احباب کا شکریہ ادا کر چکا ہوں، جنھوں نے کسی نہ کسی طرح حالات کی فراہمی میں یا دواوین مہیّا کرنے میں، یا اس جلد کی اشاعت میں دستِ تعاون بڑھایا۔ یہاں اسی کا اعادہ کرتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ان اصحاب کی توجّہ شاملِ حال نہ ہوتی، تو یہ جلد اس شکل میں منظرِ عام پر نہیں آ سکتی تھی۔ فَالحَمدُ لِلّٰہِ

نئی دلّی ۲۶ جنوری ۱۹۷۶ء　　　　　　　　　　مالک رام

فہرست

بترتیبِ حروفِ تہجّی

فہرست

بترتیبِ تاریخِ وفات

نام / تخلص	مقامِ وفات	تاریخِ وفات	صفحہ
تمنا عمادی مجیبی پھلواروی، حیات الحق	کراچی	۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء	۹۱
سیّد احتشام حسین رضوی	الٰہ آباد	یکم دسمبر ۱۹۷۲ء	۹۹
حفیظ ہوشیارپوری، عبدالحفیظ سلیم	کراچی	۱۰ جنوری ۱۹۷۲ء	۱۱۰
فرقت کاکوروی، غلام احمد	مغلسرائے	شب ۱۲/۱۳ جنوری ۱۹۷۳ء	۱۲۰
محمد اکرام، شیخ	لاہور	۷ جنوری ۱۹۷۳ء	۱۲۹
ممتاز شیریں	اسلام آباد	۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء	۱۳۲
شوکت سبزواری، سید شوکت علی	کراچی	۹ مارچ ۱۹۷۳ء	۱۳۵
ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر	بمبئی	۲۵ مارچ ۱۹۷۳ء	۱۴۵
گہر گورکھپوری، ایشوری پرشاد	گورکھپور	۱۰ جون ۱۹۷۳ء	۱۴۹
حشر سیتاپوری، سید محمد کاظم	سیتاپور	۷ جون ۱۹۷۳ء	۱۵۲
جعفر حسن (جافر ہسن)	حیدرآباد	۲۵ جون ۱۹۷۳ء	۱۵۶
حمید ناگپوری، عبدالحمید	ناگپور	۶ جولائی ۱۹۷۳ء	۱۶۴
ضیا بدایونی، ضیا احمد (پروفیسر)	علی گڑھ	۸ جولائی ۱۹۷۳ء	۱۷۰
سجّاد ظہیر، سیّد	الماآتا (روس)	۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء	۱۷۹
جذب عالمپوری، راگھوندر راؤ	حیدرآباد	۲۸ ستمبر ۱۹۷۳ء	۱۹۳
اختر حیدرآبادی، سردار بیگم	بنگلور	۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء	۱۹۸
بحر و محبوب، راجا محمد امیر احمد خان	لندن	۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء	۲۰۱
بگمٹ عظیم آبادی، غلام دستگیر خان	پٹنہ	۲۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء	۲۱۴
ابر احسنی گنوری، احمد بخش	گنّور	شب ۸/۹ نومبر ۱۹۷۳ء	۲۱۶
سلام مچھلی شہری، عبدالسلام	نئی دلی	۱۹ نومبر ۱۹۷۳ء	۲۲۴
تاب حیدرآبادی، عبداللہ بن احمد	حیدرآباد	۲۴ نومبر ۱۹۷۳ء	۲۳۵

عادل رشید، سیّد محمد منظور الحق

داغ کے مشہور شاگرد نوح ناروی کا ایک شعر ہے:

جو آنا ہے ان کو تو، اے نوح! آئیں؛ وہ رستہ، طرف، فاصلہ کچھ نہ پوچھیں
چڑھیں ریل پر، اور پہنچیں سراتھو؛ سراتھو سے نو میل دکھن ہے نارا

یہ جغرافیہ اور محلِ وقوع انھیں اس لیے بتانا پڑا کہ ایک صاحب نے ان سے پوچھا کہ حضرت! یہ نارہ کہاں ہے جس کی نسبت سے آپ ناروی کہلاتے ہیں؟ آپ جانتے ہیں، نوح ٹھہرے شاعر اور شاعر بھی ایسے کہ شعر ان کا تکیہ کلام تھا؛ انھوں نے جواب میں یہ شعر کہہ دیا۔ سائل کی تسلّی ہو گئی۔ خدا کرے کہ آپ کی بھی ہو جائے اور آپ مجھ سے یہ نہ پوچھنے لگیں کہ ہم کونسے اسٹیشن سے ریل پر چڑھیں؟ اور سراتھو کہاں ہے؟ میں شاعر نہیں ہوں اور نوح صاحب بھی ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے، ورنہ کہتا ان سے پوچھیے۔

تو نارہ کا یہ قصّہ اس سے یاد آیا کہ عادل رشید بھی ۲۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو اسی نارہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں ان کی ننھیال تھی۔ ان کے نانا مُلّاجی یہاں کے بہت بڑے پیر تھے۔ جب یہ پیدا ہوئے ہیں، تو ان کے نانا ابّا ترکِ دنیا کر چکے تھے، اور ان کے بیٹے سیّد شاہ حسام الدین احمد (عادل کے ماموں) مسندِ سجّادگی پر رونق افروز تھے۔

عادل رشید کا اصلی نام محمد منظور الحق تھا۔ ان کے والد سیّد شاہ محمد فضل الحق ضلع الہ آباد کی تحصیل سراتھو کے قصبے رشید مئی کے جاگیر دار تھے۔ یہ جاگیر انھیں بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی، جہاں وہ اپنے آبائی مکان کڑا مانکپور سے ہجرت کر کے آ بسے تھے۔ بزرگوں میں تصنیفات اور طبابت پشتوں تک رہی تھی۔ چنانچہ عادل رشید کے پر دادا اور پھر دادا سیّد شاہ محمد عبد الحق بھی اس علاقے کے مانے ہوئے حکیم تھے۔ دادا نے ان کے پیدا

ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ میں اپنے پوتے کو طب کی تعلیم دونگا اور حکیم بناؤنگا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ دادا ابا کا سال بھر بعد ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوگیا۔ والد (شاہ محمد فضل الحق) کی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی؛ انھیں اپنی کھیتی باڑی کے علاوہ صرف انھیں چیزوں سے دلچسپی تھی، جن سے اس عہد کے دوسرے جاگیرداروں کو دلچسپی تھی اور ان میں کئی طرح کی "بازیاں" شامل تھیں۔ اس کے برعکس ان کی والدہ ماجدہ (امۃ الفاطمہ) پڑھنے لکھنے اور علم وادب کا ذوق اپنے میکے سے ساتھ لائی تھیں۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر ادیب اور مصنف بنے۔ ان کی تمنا اور دعا پوری ہوئی، لیکن افسوس کہ وہ اسے دیکھنے کو زندہ نہ رہیں؛ عادل صرف آٹھ برس کے تھے کہ ۱۹۲۸ء میں وہ رحلت کر گئیں۔ اس زمانے میں خاندان کانپور میں رہتا تھا۔

۱۹۳۱ء میں کانپور میں زوروں کا فساد ہوا تھا۔ شاہ محمد فضل الحق اس سے ڈر گئے۔ انھوں نے مستقبل کے موہوم خطروں سے بچنے کے لیے کانپور سے نقلِ مکان کر کے الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں اُن کے خاندان کے لوگ اپنے محلّے دائرہ شاہ رفیع الزّماں (حکیم بادشاہ) کے گویا مالک تھے۔ اس محلّے میں "رفیع الزمان لائبریری" نام کا ایک دارالمطالعہ تھا، جس میں اردو کے کئی مشہور رسالے اور جرائد آتے تھے۔ عادل نے اگرچہ علم وادب کا ذوق اپنی والدہ سے ورثے میں پایا تھا، لیکن اس ذوق پر جِلا یہیں ہوئی۔ وہ باقاعدگی سے اس لائبریری میں جاتے اور یہاں رسالوں کا مطالعہ کرتے۔ اسی سے بڑھ کر انھیں خود بھی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ "قرض" کے عنوان سے کانپور کے رسالے "مستورات" کے خاص نمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔

اس افسانے تک "وہ سید محمد منظور الحق میلوی" تھے ——— عادل تخلص اور رشید میلوی وطن سے نسبتِ ادبی ملابست۔ لیکن بعد کو دیکھا کہ نسبت کبھی رشید میوی چھپ جاتی ہے، کبھی رشید ملیٹوی، تو انھوں نے اسے یکسر اڑا دیا؛ اور صرف عادل رشید بن گئے۔ بعد کے زمانے میں وہ اس نام سے ایسے مشہور ہوئے کہ

آج شاید ہی کوئی ان کا اصلی نام محمد منظور الحق جانتا ہو۔ شروع میں وہ بہت دن تک نعت اور قوالی لکھتے رہے۔ اس زمانے میں ان کے چند گانوں کے ہز ماسٹرس وائس کمپنی نے گراموفون ریکارڈ بھی تیار کیے تھے۔

۱۹۳۵ء میں وہ والدہ کے سلوک سے، جنھوں نے دوسری شادی کر لی تھی، تنگ آ کر گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، حال آں کہ وہ اس زمانے میں اسلامیہ انٹر کالج میں زیر تعلیم تھے اور اس کی تکمیل کی منزل ہنوز بہت دور تھی۔ وہ پہلے بریلی گئے۔ یہاں اس زمانے میں ایک ماہنامہ "شاہد" شائع ہوتا تھا۔ ساحر قدوائی (حال ڈاکٹر ساحر بریلوی، لائل پور، پاکستان) اس کے مالک اور مدیر تھے۔ عادل رشید اس رسالے میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء میں ساحر صاحب اس رسالے کو ساتھ لے کر دلی آئے، تو عادل بھی ان کے ساتھ یہاں پہنچ گئے۔ یہاں ان کا تین برس قیام رہا۔ اسی دوران میں انھوں نے یہاں کے ہفتہ وار پرچے "جمیل" کی ادارت بھی کی۔ بالآخر انھوں نے ۱۹۴۰ء میں قسمت آزمائی کرنے کو بمبئی کی راہ لی۔ ادھر ساحر نے دیکھا کہ وہ اکیلے "شاہد" کو نہیں چلا سکتے۔ انھوں نے پرچہ عادل کے سپرد کر دیا، اور خود واپس بریلی چلے گئے۔ عادل بمبئی پہنچے، تو انھوں نے اسے ہفتہ وار کر دیا اور وہیں سے شائع کرنے لگے۔

بمبئی بڑا غدّار شہر ہے۔ اگر کسی شخص کو دنیا کمانے کا خاص فن نہیں آتا، تو اس کے لیے بمبئی میں کامیابی حاصل کرنا محال نہیں، تو بہت مشکل ضرور ہے۔ عادل بھی اس فن سے نابلد تھے۔ لہٰذا انھیں بھی ہر طرح کی مشکلات سے گزرنا پڑا جن میں فاقے اور رات کو بازار کی پٹری پر سونا بھی شامل ہے۔

اس زمانے میں یہاں بمبئی میں ایک صاحب تھے سلطان حسین ــــ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے، لیکن کتابیں چھاپنے اور ان کے بیچنے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کا اپنا چھاپہ خانہ (سلطانی پریس) تھا؛ اس کے علاوہ وہ لکڑی کا بیوپار بھی تھا۔ غرض بہت کامیاب تاجر تھے۔ عادل کی ان سے دوستی ہو گئی، اور رفتہ رفتہ وہ تجارت میں ان کے شریک

بن گئے۔ انھوں نے "شاہد" بھی سلطان حسین صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس زمانے میں "شاہد" کا دفتر ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کا مرکز بن گیا۔ بمبئی کے جتنے ادیب و شاعر تھے، وہ عادل کے دوست اور "شاہد" کے دفتر کے مستقل حاضر باش تھے۔ سلطان حسین بھی عادل کو بہت مانتے تھے، چنانچہ ان کی وساطت سے بہت سے مصنّفوں کو سلطان حسین صاحب سے مالی امداد ملی۔ عادل نے خود بھی کسی زمانے میں ایک "انجمن صداقت پسند مصنّفین" قائم کی تھی۔ وہ اس کے صدر رہتے؛ حیات وارثی اس کے سکتّر تھے۔

لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے! ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد کے خلاف پولیس ایکشن ہوا۔ خدا معلوم کس نے سلطان کے خلاف رضاکاروں کی امداد کرنے کا اتہام لگایا۔ بس، پکڑ کیا تھا، سلطان حسین گرفتار کر لیے گئے۔ تین دن حوالات میں رہے۔ آخر کار کرشن چندر اور عادل رشید انھیں ضمانت پر رہا کرا لائے۔ تفتیش پر الزام غلط ثابت ہوا، اور وہ بےقصور قرار پائے۔ لیکن اس تین دن کی حوالات نے ان کے اوسان خطا کر دیے۔ انھوں نے اسے اپنی انتہائی توہین اور ذلّت تصوّر کیا۔ چنانچہ بمبئی کا سارا جما جمایا کاروبار چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔

سلطان حسین کے بمبئی سے جانے کے ساتھ ہی عادل رشید کا ادبار بھی شروع ہوا۔ ان کا اپنا ماہانہ پرچہ "حجاب" اور اشتہاری کمپنی جو انھوں نے کسی زمانے میں چلائی تھی، وہ پہلے ہی بند ہو چکی تھی۔ اب "شاہد" بھی بند ہو گیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کا عزیز ترین دوست ان سے بچھڑ گیا۔ ان کے بھلے دنوں کے تمام دوست پیٹھ دکھا گئے اور کسی نے جھوٹوں بھی ان سے نہ پوچھا کہ بھائی کس حال میں ہو؟ نوبت فاقوں تک پہنچی لیکن آفریں ہے ان کی ہمتِ مردانہ پر کہ وہ انتہائی مخالف حالات میں بھی اپنے آپ سے مایوس نہیں ہوئے۔

اب انھوں نے قلم کا سہارا لیا۔ ان کے ناول مینہ کی طرح برسنے لگے۔ ہر مہینے نیا ناول کسی مہینے دو دو بھی۔ ان کے کم و بیش ڈیڑھ سو ناول شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا ملک کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ وہ آخر تک اپنے قلم کی کمائی کے سہارے عزت و آبرو سے جیئے۔

صحت بالعموم اچھی رہی، لیکن آخر کار مسلسل کثرتِ کار نے اپنا اثر دکھایا۔ کبھی کبھی بیمار بھی

ہو جاتے تھے۔ اسی طرح کی کچھ شکایت محسوس کی، تو علاج کے لیے نانا وتی اسپتال (بمبئی) میں چلے گئے۔ وہیں پیر کے دن ۳ جنوری ۱۹۷۲ء، صبح کے ساڑھے تین بجے، دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کیا اور اسی شام جوہو کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

عادل نے ۱۹۴۱ء میں عذرا بیگم سے شادی کی تھی۔ عذرا ہلمان الارشد (حال مدیرِ ماہنامہ الشجاع، کراچی) کی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ ارشد تھانوی ان کے ماموں تھے؛ شوکت تھانوی بھی رشتے میں ماموں ہوتے تھے۔ اس نیک بیوی نے عادل کا ہر حال میں ساتھ دیا۔ ان کے چھ بچے ہیں، چار بیٹیاں (ناہید اور تسنیم اور نسرین اور شاہینہ تنویر) اور دو بیٹے (جاوید اور گلریز)

بشیر حیدر آبادی، بشیر النساء بیگم

ان کا خاندان در اصل پنجاب کا رہنے والا تھا، جہاں سے یہ لوگ ہجرت کر کے دکن میں جا بسے تھے۔ بشیر کے والد مولوی عبدالرحمٰن ریاست حیدر آباد (دکن) کے محکمۂ سیاسیات میں مددگار (اسسٹنٹ) کے عہدے پر فائز تھے؛ اور والدہ شمس النساء بیگم، میرزا صادق علی بیگ تعلقہ دار کی بھانجی تھیں۔ ماموں نے بھانجی کی تعلیم و تربیت اپنی نگرانی میں کی۔ وہ خود اپنی علم دوستی، فیاضی اور درویشانہ عادات و صفات کے لیے مشہور تھے۔ شمس النساء بیگم نے جو اس ماحول میں تربیت پائی، تو یہی خصوصیات ان کے کردار کا بھی جزو بن گئیں۔ وہ بہت اچھی خوشنویس تھیں اور خطابت میں بھی ان کا شہرہ تھا۔

بشیر ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم سراسر نجی طور پر ہوئی۔ فارسی کی تحصیل بہت حد تک اعلیٰ درجے کی تھی۔ عربی میں قرآن با معنی، تفسیر کے ساتھ پڑھا تھا۔ اردو اور فارسی شعرا کا کلام تعلیم کے دوران میں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ چونکہ حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا،(۳) لیے اس کا بیشتر حصّہ یاد میں محفوظ رہ گیا؛ اور پھر اسی سے خود شعر کہنے کی ترغیب ہوئی۔ جلد ہی کلام دلّی کے مختلف رسائل "عصمت" "ساقی" وغیرہ میں چھپنے لگا۔ مشاہیرِ دکن نے بھی ان کی ہمت افزائی کی۔ وہاں کے زنانہ رسائل "شہاب" "ناہید" وغیرہ نے ان کی پذیرائی کی۔ نفاستِ طبع کے ساتھ شعر و سخن کے اسی شغف کے باعث خواجہ حسن نظامی مرحوم (ف جولائی ۱۹۵۵ء) نے انھیں "چمن آرا" کا خطاب عطا کیا تھا۔

شروع میں مہاراجا کشن پرشاد (ف ۱۹۴۰ء) کے درباری شاعر صادق حسین غبار سے مشورہ رہا۔ غبار نے جلد ہی کہہ دیا کہ کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔ ان کے بعد سیّد علی حیدر نظم طباطبائی (ف

۱۹۳۳ء) اور اپنے والد کے دوست ابوظفر عبدالواحد صاحب سے بھی کچھ استفادہ کیا تھا۔

وہ مدّتوں ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد کے شعبۂ نسواں کی نائب معتمد رہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم (ف ستمبر ۱۹۶۲ء) کو ان سے ہمیشہ پورا تعاون ملا اور وہ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ دکن میں عورتوں کی تعلیم و ترقی میں ان کی مساعی بہت قابلِ قدر تھیں۔

ان کا مجموعۂ کلام "آبگینۂ شعر" بھی ادارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) کی طرف سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی، اس میں مذہب اور اخلاق کا جو مقام تھا، ناممکن تھا کہ وہ اس سے متاثر نہ ہوتیں۔ چنانچہ اس مجموعہ میں بھی حمد و نعت پر متعدّد نظمیں ملتی ہیں۔ یوں بھی انھیں غزل کی بہ نسبت نظم سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس دور کے شاعروں میں وہ اقبال سے بہت متاثر تھیں۔ انھیں بزرگانِ دین سے والہانہ عقیدت تھی؛ اور ان کی بعض معرکے کی نظمیں اسی جذبے کی مظہر ہیں۔ نظم کے علاوہ نثر سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔

۱۹۳۶ء میں مرزا ضامن علی صفوی غازی میر عمارت اور ٹھیکیدار سے نکاح ہوا۔ اتفاق سے وہ بھی ہم مشرب نکلے۔ غازی صاحب کے والد (یعنی بشیر کے خسرِ بزرگوار) مرزا اکرام علی صفوی بھی شعر کے رسیا اور سخن شناس بزرگ تھے۔ انھوں نے بشیر کے ذوقِ شعری کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں گھریلو پریشانیوں سے بےفکر کر دیا۔ اس سے بشیر نے بہت فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے اولادِ جسمانی میں صرف ایک صاحبزادہ (راشد علی صفوی) اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

صحت بہت دن خراب رہی۔ اسی میں یکشنبہ ۲۰ فروری ۱۹۷۲ء (۴ محرم ۱۳۹۲ھ) بعدِ مغرب حیدر آباد میں رحلت کی۔ جنازہ اگلے دن ۲۱ فروری کو اٹھا۔ نمازِ جنازہ مسجد شطاریہ (دبیر پورہ) میں ادا ہوئی اور انھیں قبرستان ملک پیٹ (مقابل ٹیپہ خانہ صحیفہ) میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝ قبر کے لیے ان کے جاں نثار شوہر غازی صاحب نے سنگِ مرمر اور سنگِ سیاہ کا خوبصورت تعویذ تیار کرایا ہے۔

بہت لوگوں نے تاریخِ وفات کہی حکیم محمد خواجہ شفیع حسن عارف (ابو العلائی آغائی) کے قطعے کا آخری شعر ہے۔

ندا آئی رضوان سے، عارف! یہی
کہ کہہ دو: ٹھکانہ ہے خلدِ بریں
(۱۳۹۳)

اب کلام کا نمونہ دیکھیے، جو "آبگینۂ شعر" سے ماخوذ ہے: پہلے دو نظمیں ہیں اور پھر غزل کے چند شعر:

نجمِ سحر

نجمِ سحر! بتا، تجھے اللہ کی قسم! — کس سوچ میں ہے تو کہ بڑھاتا نہیں قدم
چھپتے نہیں چھپائے سے اندازِ سوز و غم — اس درجہ کیوں اداس ہے، اے پیکرِ الم!
تاروں کے قافلے گئے، رخصت ہوا قمر — شب زندہ دار ہو گئے، دنیا سے بےخبر
افسردہ کس کی یاد میں اب تک کھڑا ہے تو؟ — ہاں، کن توہمات میں الجھا ہوا ہے تو؟

اے بےخبر! خبر ہے مجھے تیرے حال کی
معلوم مجھ کو وجہ ہے تیرے ملال کی

یہ خوفِ مرگ، جس سے ہے لرزاں ترا وجود — میرے جنونِ شوق میں، ہے خواہشِ نمود
تابع بہ کائنات ہے، میرے جنون کی — بود و نبود میں ہے کشش کاف و نون کی
تو چاہتا ہے دیکھنا، کیا ہوگا اب یہاں — بے انجم و قمر، نظر آئیگا کیا جہاں!
وہ دیکھ کرنیں آتی ہیں، کیا دور دور سے — دنیا چمک اٹھی شہِ خاور کے نور سے
پھر گرم ہو گی کل کی طرح بزمِ کائنات — گردش کرینگے جامِ اجل، ساغرِ حیات
سورج غروب ہوگا تو پھر شام آئیگی — تاریک رات پھر وہی جادو جگائیگی

قائم نظامِ دہر، تنوع کے بل پہ ہے
ثابت قدم وہی ہے، جو خنداں اجل پہ ہے

رُبابِ حیات

موجِ بقا کہیں، کہیں نقشِ ثبات ہے — ہر سمت نغمہ ریز، رُبابِ حیات ہے

تنویرِ روحِ عکس ہے حسنِ دوام کا
دنیا طلسم گاہِ حیات و ممات ہے

ہر لحظہ ایک عالمِ نو کا ظہور ہے،
معمورۂ جنوں میں نہ دن ہے، نہ رات ہے

ذوقِ نظر سے باقی ہے یہ حسنِ کائنات
دل بارگاہِ تاب و تبِ واردات ہے

پوشیدہ گو نگاہوں سے ہے دہر آفریں
لیکن محیطِ دہر، وہی ایک ذات ہے

ٹوٹی ہوئی امیدوں کی غمناک داستاں
دنیائے انبساط کی تاریک رات ہے

افسانے بن رہے ہیں عروج و زوال کے
صورت گرِ حیات، مآلِ حیات ہے

گو شکوہ سنجِ گردشِ دوراں نہیں ہیں ہم
پر کیا کہیں کہ دل ہے کہیں، اور کہیں ہیں ہم

بیزار اہلِ بزم ہیں، ساقی ہے بدگماں
محفل میں یوں شریک ہیں، جیسے نہیں ہیں ہم

قفس میں چین ہے، اے ہمصفیر! رہنے دے
فسانہ ہائے چمن، ذکرِ آشیاں کب تک

گیا ہے دوش، تو فردا کبھی آنے والا ہے
زبانِ حال پہ ماضی کی داستاں کب تک

بشیر! زندگی جاوداں ہے موت کے بعد
یہ جاوداں سہی، لیکن یہ جاوداں کب تک!

ہے رات کی سیاہی بھی تمہیدِ صبح کی
غم ہو کہ انبساط، نہیں جاوداں کوئی

یا رب! تو لاج رکھ لے جبینِ نیاز کی
ہے تیرے آستاں کے سوا آستاں کوئی؟

عبث سننا سنانا ہے فسانہ دردمندی کا
کہ صبر و شکر کا اک نام مجبوری بھی ہوتا ہے

ذوقِ نظارہ ہو، تو گلستاں میں، بشیر!
ہر شجر قابلِ اظہار نظر آتا ہے

ہوتی ہے وقت ہی پر اپنے پرائے کی تمیز
ورنہ بدخواہ بھی غمخوار نظر آتا ہے

زندگی گھر گئی ماحولِ پریشاں میں، بشیر!
ہر بشر پیکرِ افکار نظر آتا ہے

یحییٰ اعظمی، محمد یحییٰ

ان کا آبائی وطن قصبہ مہاراج گنج (ضلع اعظم گڈھ) تھا، جہاں وہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً ۱۹۱۹ء میں انھوں نے مقامی اسکول سے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد فارسی کی تعلیم اپنے والد مولوی ضیا اللہ سے پائی۔ مولوی صاحب موصوف پرانے طرز کے مدرس اور اردو اور فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کی اردو اور فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ یحییٰ صاحب نے ان کی تعلیم سے پورا استفادہ کیا۔ بلکہ جب زمانۂ تعلیم کے دوران ہی میں انھیں شعرگوئی کا شوق پیدا ہوا، تو کلام بھی والد ہی کو دکھایا۔ انھوں نے حوصلہ افزائی بھی کی اور کلام پر اصلاح بھی دی۔

۱۹۲۰ء میں ہماری سیاسی تحریک نے نیا موڑ لیا تھا۔ خلافت تحریک بھی اپنے پورے شباب پر تھی۔ نوجوان یحییٰ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ دراصل ان کی قومی اور ملّی شاعری کا منبع یہی سیاسی تحریکیں ثابت ہوئیں۔

جون ۱۹۲۵ء میں بعض احباب اور بزرگوں کی وساطت سے وہ دار المصنّفین، اعظم گڈھ کے دفتر سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق انھوں نے عمر بھر نباہا۔ یہیں کے قیام کے دوران میں انھوں نے پرائیوٹ طور پر دسویں درجے کا انگریزی امتحان بھی پاس کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی باقاعدہ تعلیم کسی درسگاہ کی مرہونِ منّت نہیں تھی۔ اپنے وطن کے مڈل اسکول کا تعلق بھی برائے نام رہا۔ جیسا کہ خود انھوں نے ایک مرتبہ بتایا تھا، انھوں نے جو کچھ بھی پایا، گھر کی تعلیم سے۔ اُردو، فارسی کا ذوق ذاتی مطالعے اور فاضل بزرگوں اور شفیقوں کے فیضِ صحبت اور حسنِ تربیت کا نتیجہ تھا۔

دار المصنّفین میں انھیں جو فضا میسّر آئی، یہ سراسر علمی اور ادبی تھی۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم (ف ۱۹۵۳ء) کی صحبت میں ان کے ذوقِ شعر گوئی نے بہت ترقی کی۔ اب وہ برابر کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے۔ غالباً ان کی سب سے پہلی نظم جو "معارف" میں شائع ہوئی، وہ غازی نادر شاہ مرحوم والیِ افغانستان کے حادثۂ قتل (۸ نومبر ۱۹۳۳ء) سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔ یہ "خطاب بملّتِ افغان" کے عنوان سے "معارف" کے دسمبر ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شامل ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ افغانستان کے مشہور ہندستان دوست شاعر سرور خاں صبا نے کیا تھا جو ان کے اپنے جواب کے ساتھ وہاں کے رسالے "کابل" کی اشاعت ۶ جنوری ۱۹۳۴ء میں چھپا تھا۔ یحییٰ اعظمی نے پھر اس کا جواب فارسی میں لکھا جو "معارف" کی اشاعت مارچ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا ہے۔

اپنی قومی اور سیاسی شاعری کے باعث وہ قوم پرور طبقے میں نہ صرف متعارف تھے، بلکہ خاصے مقبول تھے۔ چنانچہ ان کے کلام کا مجموعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (ف مئی ۱۹۶۹ء) کے ایما پر "نوائے حیات" کے عنوان سے حالی پبلشنگ ہاؤس، دلی نے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے شروع میں مقدمہ مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم کا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں دار المصنّفین، اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔

کلام کا دوسرا مجموعہ "نوائے عصر" بھی جنوری ۱۹۷۰ء میں اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کے ساتھ پیش لفظ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا ہے۔

یحییٰ اعظمی مرحوم شبلی اسکول کے شاعر تھے اور ان کے ذوقِ شعری کی تربیت میں اقبال احمد سہیل کا بہت ہاتھ تھا۔ شبلی (ف نومبر ۱۹۱۴ء) اور سہیل (ف نومبر ۱۹۵۵ء) کا جتنا کامیاب اتباع انھوں نے کیا ہے، وہ کسی سے نہ ہو سکا؛ ان کے دونوں مجموعے اس دعوے پر شاہدِ عادل ہیں۔ انھوں نے رجالِ عصر سے متعلق جو نظمیں کہی ہیں اور ان میں کلام کا جو شکوہ ہے، اس سے ان کی قدرتِ زبان، فارسی میں درک، فن کی مہارت ایک ایک مصرعے سے نمایاں ہے۔

شاعر کے علاوہ، ذاتی طور پر بھی وہ بہت اچھے انسان تھے؛ درویش صفت اور منکسر

مزاج اور قناعت کا مجسمہ۔ دارالمصنفین کی نوکری سے جو تنخواہ انھیں ملتی تھی، وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کو بھی بمشکل ہی کفایت کرتی ہوگی۔ لیکن اللہ کے اس نیک بندے نے صبر و شکر سے اسی میں ساری عمر بسر کر دی۔

انھیں جگر کی خرابی اور فشارِ دم کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ آخر میں حبسِ بول کے دورے پڑنے لگے۔ اسی میں کوئی دو ہفتے کی علالت کے بعد ۲۲ فروری ۱۹۷۲ء چار بجے شام رحلت کی۔ تدفین اگلے دن ۲۳ فروری صبح کے دس بجے ہوئی۔ نمازِ جنازہ حکیم محمد اسحاق صاحب نے پڑھائی اور اعظم گڑھ شہر کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ اپنے پیچھے جسمانی اولاد میں تین لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑے۔

دیکھا جائے، تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ بنیادی طور پر یحییٰ غزل کے شاعر نہیں۔ ان کے جوہر نظم میں کھلتے ہیں اور فارسی کی پرشکوہ ترکیبوں اور قدرتِ زبان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اگر انھیں قصیدہ یا رجزیہ لکھنے کی ضرورت پیش آتی، تو اس میدان میں مشکل ہی سے کوئی ان کا حریف ثابت ہو سکتا تھا۔ انھیں زیادہ شہرت اس وجہ سے نہیں مل سکی کہ وہ پراپیگنڈے کے ذرائع سے مجتنب رہے۔ ممکن ہے اعظم گڑھ کے مقامی اجتماعوں یا مشاعروں میں کبھی شریک ہوئے ہوں، لیکن وہ باہر نہیں جاتے تھے۔ رسائل میں کبھی اپنا کلام نہیں بھیجتے تھے۔ تاہم اہلِ نظر کے حلقے انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ نمونے کے طور پر کچھ کلام دیکھیے۔

آہ اقبال

یونہی ہوتے رہینگے حشر تک شام و سحر پیدا	نہ ہوگا اب مگر اقبال سا صاحب نظر پیدا
ملا تھا تجھ کو جو روزِ ازل فیضانِ فطرت سے	کہاں ہر پیکرِ خاکی میں وہ سوزِ جگر پیدا
نہ اٹھا پھر کوئی رمزِ "انا" کا عارفِ کامل	ہوا تھا ایک تو ہی خود شناس و خودنگر پیدا
تڑپتا ہی رہیگا ذرہ ذرہ خاکِ مشرق کا	تری معجز نوائی نے کیا ہے وہ اثر پیدا
دیا ہے آب و گل کو تو نے وہ دہبِ پرافشانی	کیے ہیں قطرۂ شبنم نے بھی اب بال و پر پیدا
کیا ملت کو پھر ذوقِ یقیں سے آشنا تو نے	ترے دم سے ہوئی پھر چشمِ باطن میں نظر پیدا

ہوئیں تجھ سے نوائے صبح میں کیفیتیں پیدا دلِ دردآشنا میں لذّتِ آہِ سحر پیدا
زسرتاپا یقیں، مستِ خودی، واقفِ خود آگاہی کہاں اب دہر میں ہوتے ہیں ایسے باخبر پیدا
"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

علمائے سلف اور علمائے دورِ حاضر
اور
ہنگامۂ تکفیر

ہلا دیتا تھا اک عالم کو شورِ لاتخف اُن کا قیامت تھا جہادِ حق میں رہنا سربکف ان کا
انھیں شایانِ شاں تھا وارثِ علمِ نبی کہنا کہ تھا خُلقِ حسن، سرمایۂ مجد و شرف ان کا
سبق دیتے تھے صلح و خیر کا افرادِ امت کو ضیا افگن تھا فیضِ علم و عرفاں ہر طرف ان کا
نوائے دعوتِ حق لے کے وہ جس دم نکلتے تھے تو خود کرتا تھا باطل خیر مقدم صف بصف ان کا
قیامت ہے، اگر اس دور میں اخلاف کے ہاتھوں وہ نقدِ سیزدہ صد سالہ ہو جائے تلف ان کا
اب ان کی مسندِ ارشاد پر وہ لوگ بیٹھے ہیں کہ ہر طرزِ عمل ہے باعثِ ننگِ سلف ان کا
بزرگوں سے ملی تھی جو متاعِ بے بہا، کھودی کہاں اب آہ! وہ سرمایۂ عزّ و شرف ان کا
وہی ہے ابرِ نیساں، اب بھی مصروفِ گہرباری مگر اب لُولُوئے لالا سے ہے خالی صدف ان کا
فقط لے دے کے، ہے اک مشغلۂ تکفیر کا جاری
مسلمانوں کی جان و دین و ایماں ہیں ہدف ان کا

متاعِ دوجہاں کونین کا حاصل سمجھتے ہیں ازل سے ہم بحمد اللہ دل کو دل سمجھتے ہیں
جمالِ عشق کی زیرنگیوں کو دیکھنے والے غبارِ قیس کو بھی رُوکشِ محمل سمجھتے ہیں
دلِ درد آشنا کیا ہے؟ عطیہ فیضِ فطرت کا اُسے دیتے ہیں جس کو جوہرِ قابل سمجھتے ہیں
جبینِ شوق کو مطلوب ہے بس نقشِ پا اُن کا نشانِ ماسوا کو ہم خطِ باطل سمجھتے ہیں
کہاں موجِ نسیمِ صبح کی یہ عنبر افشانی
کوئی فتنہ ہم اس میں اور بھی شامل سمجھتے ہیں

کرلیں اب شامِ غم کو ہم رنگیں — رولیں خوں چشمِ اشکبار سے ہم

کیا کھلیگی کبھی یہ دل کی کلی! — خوش ہوں کیا آمدِ بہار سے ہم

لاتے ہیں اک بہارِ داغِ جنوں — ارمغانِ حسن کے دیار سے ہم

ہو گئے لذّت آشنائے نشاط — تلخیِ جورِ روزگار سے ہم

لاکھ وعدہ وفا نہ ہو، پھر بھی — مست ہیں کیفِ اعتبار سے ہم

آپ ہوں خنجر آزما تو کبھی — باز آئینگے جانِ زار سے ہم

دل میں کیا کیا لیے ہوئے اٹھے — آستانِ حریمِ یار سے ہم

ہیں باندازِ شوق مست و خراب
لذّتِ کیفِ اعتبار سے ہم

لکھنؤ

دمے بگزار، اے دورِ فلک! تا لکھنؤ بینم — بچشمِ آرزو آں مرغزارِ رنگ و بو بینم

خوشا شہرے کہ بر خاکش سوادِ خلد می زیبد — چہ فردوسے کہ در باغش بہشتِ آرزو بینم

بہارِ مرغزارش دامنِ دل می کشد ایں جا — زبس ہر سمت جوشِ سبزہ و فیضِ نمو بینم

تو می گوئی چمن اندر چمن، ہر رہگذر باشد — تو می گوئی ختن اندر ختن، ہر کاخ و کو بینم

ہمہ شہرست آرے مرغزارِ حسن و رنگینی — بہارِ سبزہ و سرو و صنوبر چار سو بینم

چہ می گویم، چہ کارِ مشکلے افتد نگاہم را — چوں ہر جانب ہجومِ شاہدانِ لالہ رو بینم

بلے زیبد، اگر ایں شہر را رشکِ ارم خوانم — کہ خاکِ عنبریں ش را سراپا رنگ و بو بینم

نگشتم سیر دردا، از بہارستانِ رنگینش
ہنوزم آرزو باشد کہ دیگر لکھنؤ بینم

ڈاکٹر رادھا کرشنن

وہ فاضلِ یگانہ و دانشورِ عظیم — روشن ہے جس سے مشرق و مغرب میں نامِ ہند

خاکِ وطن کا مایۂ صد ناز فلسفی، — ہے جس کے دم سے دہر میں اونچا مقامِ ہند

وہ جس کے فیضِ فلسفہ و علم و فضل سے — دانشورانِ عصر میں ہے احترامِ ہند

وہ جس کے دستِ فن نے سنوارا ہے مدّتوں
روئے نگارِ صبحِ وطن، زلفِ شامِ ہند

وہ جس کی موجِ نکہتِ تحقیق و فکر سے
ہر دور میں رہا ہے معطّر مشامِ ہند

جس کا کمالِ علم، ہے رشکِ رجالِ عصر
جس کا جمالِ فکر، ہے فخرِ عظامِ ہند

جس کی حیات خدمتِ ملّت کی نذر ہے
ہے جس کی ذات مرجعِ اہل و عوامِ ہند

تبریک تجھ کو وقت کی جمہوریت! کہ آج
اک فلسفی ہے صدر نشینِ نظامِ ہند

وہ صدر، جس سے دہر میں ہے عظمتِ وطن
جس کا شعار ہے ادب و خدمتِ وطن

ناصر کاظمی، ناصر رضا

اگرچہ کچھ موروثی زمینداری بھی تھی لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے خاندان میں سپاہگری اور فوج کی ملازمت پشتوں سے چلی آتی تھی۔ چنانچہ ان کے والد محمد سلطان بھی فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ بزرگوں کا وطن انبالہ شہر تھا، اور یہیں ناصر صاحب ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم ایف، اے تک پائی: دسویں درجے تک اپنے وطن میں اور اسلامیہ کالج لاہور میں۔ بی اے میں تعلیم پا رہے تھے کہ بوجوہ امتحان دینے سے پہلے ہی پڑھائی چھوڑ چھاڑ، واپس انبالے چلے گئے۔ یہاں دو ڈھائی سال گھر کی زمینداری کا کام دیکھتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں پھر لاہور چلے گئے اور اس کے بعد اسی شہر کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا۔ اوّلاً چندے ایک نیم سرکاری دفتر میں نوکری کی تھی۔ لیکن ان کا مزاج ادبی تھا، یہاں دل کیسے لگتا! چنانچہ سال بھر بعد 'اوراقِ نو' ماہنامے کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ تین برس تک یہاں کام کیا اور ۱۹۵۲ء میں مشہور رسالۂ 'ہمایوں' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ پھر آخر تک یہیں رہے۔

انھوں نے شاعری طالبعلمی کے زمانے میں شروع کی تھی۔ اس دور میں ان پر میر اور فانی کا گہرا اثر تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں جب دوسرا دور شروع ہوا، تو وہ فانی کے چنگل سے آزاد ہو گئے۔ اب انھوں نے حفیظ ہوشیار پوری سے اپنے کلام پر اصلاح لینا بھی شروع کی۔

۱۹۵۵ء کے لگ بھگ انھوں نے غزل میں وہ رنگ اختیار کیا، جو مسلسل غزل اور نظم سے قریب تر تھا۔ اب خیالات میں پختگی آگئی تھی یہی اسلوب آخر تک قائم رہا۔ وہ میر کے

کامیاب تتبع کہے جاسکتے ہیں۔ وہی جذباتی دھیما پن اور کسک اور سپردگی کا لہجہ اور انداز جو میر کی خصوصیت ہے۔ لیکن اس میں بھی انھوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکال لی تھی۔ میر کے علاوہ ان پر ہندی شاعری بالخصوص دوہے کا بھی نمایاں اثر تھا۔

ان کے کلام کا انتخاب 'برگِ نے'، کے عنوان سے پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ابتدائی زمانے کے چند شعروں کے علاوہ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۲ء کا کلام شامل تھا۔ جب کتاب دوسری مرتبہ (۱۹۵۷ء میں) شائع ہوئی، تو اس میں ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء کا انتخاب بھی اضافہ کر دیا گیا۔ وفات کے سال بھر بعد دوسرا مجموعۂ کلام 'دیوان' کے عنوان سے شائع ہوا۔ تیسرا، 'پہلی بارش' ۱۹۷۵ء میں چھپا۔ اس میں بیشتر مسلسل غزلیں ہیں۔

۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا، اور ان کے ساتھ اردو کا ایک پختہ کار، روایت کا پابند، وضعداری کا دلدادہ شاعر ہم سے جدا ہو گیا۔

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی　　برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی
اے دل! کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب!　　ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی
اے دوست! ہم نے ترکِ محبت کے باوجود　　محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

پُرساں نہ تھا کوئی، تو یہ رسوائیاں نہ تھیں　　ظاہر کسی پہ حالِ پریشاں نہ تھا کبھی
دورِ خزاں میں یوں مرے دل کو قرار ہے　　میں جیسے آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی
کیا دن تھے، جب چمن میں خزاں بھی بہار تھی　　یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی
بے کیف و بے نشاط نہ تھی اس قدر حیات　　جینا اگرچہ عشق میں آساں نہ تھا کبھی

اس پیکرِ ناز کا فسانہ　　دل ہوش میں آ گئے، تو سنائے

ہزار شکر کہ ہم نے زباں سے کچھ نہ کہا　　یہ اور بات کہ پوچھا نہ اہلِ دنیا نے
ترے حضور میں بھی دل کانپ کانپ اٹھتا ہے　　مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں

یہ بھی کیا شامِ ملاقات آئی　　لب پہ مشکل سے تری بات آئی
صبح سے چپ ہیں ترے ہجر نصیب　　ہائے، کیا ہو گا، اگر رات آئی!

نازِ بیگانگی میں کیا کچھ تھا — حسن کی سادگی میں کیا کچھ تھا
کتنے بیتے دنوں کی یاد آئی — آج تیری کمی میں کیا کچھ تھا

زمانہ پرسشِ غم بھی کرے، تو کیا حاصل — کہ تیرا غم، غمِ لیل و نہار بھی تو نہیں
تو ہی بتا، ترے بے خانماں کدھر جائیں — کہ راہ میں شجرِ سایہ دار بھی تو نہیں

نہ غمِ زندگی، نہ دردِ فراق — دل میں یونہی سی ہے طلب کوئی
دیکھتے دیکھتے تاروں کا سفر ختم ہوا — سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو
سایے کی طرح مرے ساتھ رہے رنج و الم — گردشِ وقت کہیں راس نہ آئی مجھ کو

کتنے شوریدہ سر تھے پروانے — شام ہوتے ہی چل مرے کچھ تو
ایسا مشکل نہیں ترا ملنا — دل مگر جستجو کرے کچھ تو

ترے خیال سے لَو دے اٹھی ہے تنہائی — شبِ فراق ہے، یا تیری جلوہ آرائی
یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گذرا — کہ اس نے حال بھی پوچھا، تو آنکھ بھر آئی
دلِ فسردہ میں پھر دھڑکنوں کا شور اٹھا — یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کن دنوں کی یاد آئی!
میں سوتے سوتے کئی بار چونک چونک پڑا — تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی
پھر اس کی یاد میں دل بیقرار ہے، ناصر! — بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی

حالِ دل ہم بھی سناتے، لیکن — جب وہ رخصت ہوا، تب یاد آیا
دن گزارا تھا بڑی مشکل سے — پھر ترا وعدۂ شب یاد آیا
تیرا بھولا ہوا پیمانِ وفا — مر رہیں گے اگر اب یاد آیا

بگولے یوں اڑے پھرتے ہیں خشک جنگل میں — تلاشِ آب میں جیسے غزالِ آوارہ

خدا وہ دن نہ دکھائے تجھے کہ میری طرح — مری وفا پہ بھروسہ نہ کر سکے تو بھی
تجھے یہ غم کہ مری زندگی کا کیا ہوگا! — مجھے یہ ضد کہ مداوا نہ کر سکے تو بھی

وجہِ تسکیں بھی ہے خیال اس کا — حد سے بڑھ جائے، تو گراں بھی ہے
زندگی جس کے دم سے ہے، ناصر! — یاد اس کی عذابِ جاں بھی ہے

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں — کیا سناتی ہے صبا، غور سے سن

رنگ بھی منتِ کشِ آواز نہیں — گل بھی ہے ایک نوا، غور سے سن
خامشی حاصلِ موسیقی ہے — نغمہ ہے نغمہ نما، غور سے سن
ہر قدم راہِ طلب میں، ناصر! — جرسِ دل کی صدا، غور سے سن

ناصر! یہ وفا نہیں، جنوں ہے — اپنا بھی نہ خیر خواہ رہنا

تیرا ملنا تو خیر، مشکل تھا — تیرا غم بھی جہاں نے چھین لیا
اک ہمیں بارِ چمن ہیں، ورنہ — غنچے غنچے کو صبا چاہتی ہے

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے — دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے!
یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب — اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے
اب بھی تو پاس نہیں ہے، لیکن — اس قدر دور کہاں تھا پہلے؟

کیوں نہ کھینچے دلوں کو ویرانہ — اس کی صورت بھی اپنے گھر سی ہے

راس عہدِ نو میں قدرِ متاعِ وفا نہیں — اُس رسم و راہِ عہدِ کہن کو ترس گئے
منزل کی ٹھنڈکوں نے لہو سرد کر دیا — جی سُست ہے کہ پانو چبھن کو ترس گئے

اُس نے منزل پہ لا کے چھوڑ دیا — عمر بھر جس کا راستہ دیکھا

جو گھر اجڑ گئے، ان کا نہ رنج کر، پیارے! — وہ چارہ کر کہ یہ گلشن اُجاڑ سا نہ لگے

اس کے آنے کی کچھ کہو، یارو! — نیند تو خیر آ ہی جائیگی
منہ لپیٹے پڑے رہو، ناصر! — ہجر کی رات ڈھل ہی جائیگی

ہم نے تجھ کو لاکھ پکارا، تو لیکن خاموش رہا — آخر ساری دنیا سے ہم تیرے بہانے روٹھ گئے

کوئی جھونکا جو سرِ شام آیا — میں یہ سمجھا، ترا پیغام آیا
زندگی اس کے تصور میں کٹی — دور رہ کر بھی وہی کام آیا

نہ پھول جھڑتے میں اہم پر، نہ برق گرتی ہے — پڑے ہوئے ہیں بعنوانِ سبزۂ بیکار

اب دل میں کیا رہا ہے! تری یاد ہو، تو ہو — یہ گھر اسی چراغ سے آباد ہو، تو ہو

ایک تم ہی نہ مل سکے، ورنہ — ملنے والے بچھڑ بچھڑ کے ملے۔

یہ کیا کہ ایک طور سے گذرے تمام عمر — جی چاہتا ہے، اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ہر شے پکارتی ہے پسِ پردۂ سکوت لیکن کسے سناؤں، کوئی ہمنوا بھی ہو

عمر بھر کی نواگری کا صلہ اے خدا کوئی ہمنوا ہی دے

زرد رُو ہیں ورق خیالوں کے اے شبِ ہجر! کچھ سیاہی دے

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

آرزو ہے کہ تو یہاں آئے اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصرؔ! اداسی بال کھولے سو رہی ہے

اک نیا دور جنم لیتا ہے ایک تہذیب فنا ہوتی ہے

اب جی میں ہے کہ سر کسی پتھر سے پھوڑیے ممکن ہے قلبِ سنگ سے نکلے کوئی پری

شور برپا ہے خانۂ دل میں کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئیگا ناصرؔ! غم نہ کر، زندگی پڑی ہے ابھی

یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں پھر بھی ہر دل کے مقدّر میں نہیں تنہائی

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصرؔ! تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

زندگی بھر وفا ہمیں سے ہوئی سچ ہے یارو! خطا ہمیں سے ہوئی

ستمِ ناروا تجھی سے ہوا تیرے حق میں دعا ہمیں سے ہوئی

ہاتھ زخمی ہیں، تو پلکوں سے گلِ منظر اٹھا پھول تیرے ہیں نہ میرے، باغ کس کا ہے، نہ پوچھ

کہیں ملا، تو کسی دن منا ہی لینگے اسے وہ زود رنج سہی، پھر بھی یار اپنا ہے

مری خموش نگاہوں کو چشمِ کم سے نہ دیکھ میں رو پڑا، تو دلوں کے طبق ہلا دونگا

زباں سخن کو، سخن بانکپن کو ترسیگا سخن کدہ مری طرزِ سخن کو ترسیگا۔

کہتے ہیں، غزل قافیہ پیمائی ہے، ناصرؔ! یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

یوسف ظفر، محمد یوسف

یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کو مری (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ غلام رسول کامیاب تاجر تھے اور ان کا عمائدِ شہر میں شمار ہوتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ گویا ظفر صاحب کو شاعری بھی ورثے میں ملی

یہ ابھی زیرِ تعلیم تھے کہ طویل علالت کے بعد ۱۹۲۹ء میں والد کا انتقال ہوگیا۔ مزید المیہ یہ ہوا کہ ظفر سے بڑی ایک ہمشیر تھیں، جو والد کی وفات کے وقت پاس کھڑی تھیں؛ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کرسکیں، باپ کی لاش دیکھ کر ان کے دل کی حرکت بھی بند ہوگئی۔ یوں گھر سے بیک وقت دو دو جنازے نکلے۔

ظفر صاحب اس وقت ساتویں درجے میں زیرِ تعلیم تھے۔ پندرہ برس کی عمر اور دو ایسے شدید صدمے! غریب کی دنیا تاریک ہوگئی۔ شدّتِ جذبات نے شعر کی صورت اختیار کرلی۔ انھوں نے اپنی پہلی نظم اسی موقع پر کہی، جو گویا مرثیہ تھی۔

۱۹۳۶ء میں بی اے پاس کیا اور اگلے برس ۱۹۳۷ء میں تلاشِ روزگار میں دلّی پہنچے۔ اسی زمانے میں جوش ملیح آبادی نے پنڈت برادرز کی سرپرستی میں ماہنامہ "کلیم" جاری کیا تھا۔ ظفر کی ان سے ملاقات ہوگئی۔ یہ بہت پریشان حال تھے۔ پوری کوشش کے باوجود انھیں کہیں کوئی کام نہیں ملا تھا۔ انھوں نے بیروزگاری کے ایّام میں دیواروں پر اشتہار چسپاں کرنے تک کا کام کیا تھا اور اس کی اجرت سے پیٹ بھرنے کو روٹی کمائی تھی۔ جوش نے انھیں کلیم کی منیجری کی پیشکش کی۔ لیکن یہاں نبھ نہ سکی۔ چند ماہ بعد وہ مستعفی ہوکر لاہور واپس چلے گئے۔ یہاں انھوں نے محکمۂ انہار میں کلرکی اختیار کرلی۔ اس دفتر میں پانچ

برس رہے۔ ۱۹۴۳ء میں میاں بشیر احمد (مدیر ہمایوں) نے انھیں اپنے یہاں بلالیا۔ یہ زمانہ ان کا نسبتاً اطمینان اور فن کے پہلو سے کامیاب گذرا۔ لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کا علم ہوا اور انھیں شاعر کی حیثیت سے شہرت بھی ملی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ریڈیو پاکستان میں ملازمت مل گئی اور وہ اس میں منسلک ہو کر راولپنڈی چلے گئے۔ ۷ مارچ ۱۹۶۲ء بوقتِ شب راولپنڈی ہی میں انتقال ہوا۔

ظفر بیحد حساس طبیعت کے انسان تھے۔ اگرچہ وہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن والد کی طویل علالت نے نہ صرف ان کا کاروبار تباہ کر دیا، بلکہ علاج معالجے نے اندوختہ بھی ختم کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد اپنی اور گھر بار کی ذمہ داری ان کے کمزور کندھوں پر آپڑی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں حزن ویاس کا عنصر بہت نمایاں ہے۔

شروع میں غزل کہتے تھے۔ کلیم سے تعلق کے زمانے میں جوش کے زیرِ اثر نظم کہنے لگے۔ لاہور گئے تو احسان دانش اور میراجی کی معیت میں یہ رنگ پختہ ہو گیا۔ آخری دو ایک سال میں پھر غزل کی طرف مائل ہو گئے تھے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کے جوہر غزل کی بجائے نظم میں زیادہ کھلتے ہیں۔ اس میں ان پر اختر شیرانی اور فیض کا کافی اثر تھا۔ آخری زمانے میں نعت پر بھی خصوصی توجہ رہی۔

وہ پُر گو تو نہیں کہے جا سکتے لیکن بیحد زُود گو ضرور تھے۔ "زنداں" اور "زہر خند" دو مجموعے تقسیمِ ملک سے پہلے شائع ہوئے تھے، اس کے بعد کے کلام کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ زہر خند سے کچھ نظموں کا انتخاب پیش خدمت ہے۔ ان کے کلام میں آزادہ روی اور جدّتِ تعبیر کا عنصر نمایاں ہے۔

شعر و شاعری

سوچنا یوں تو بھلا ہے، مگر ایسی کیا سوچ
جس سے بیدار نہ ہو جوہرِ ذاتی اپنا
ہیچ ہے غیر مقفّٰی و مقفّٰی کا خیال
مجھ کو کیا اس سے کہ شعروں میں مرا ذوقِ نظر

ہے وہی جو مجھے ممتاز کرے دنیا میں
کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو
اسی رفتار سے چلنا ہے کہ جس سے اب تک
دھیرے دھیرے مرے ہمعصر چلے جاتے ہیں؟
کیا مجھے شہرت و عزّت کے لیے جینا ہے؟
داخلِ فرض ترنّم بھی ہے شاعر کے لیے؟
گرد آلودہ جبیں اور گریباں صد چاک
شاعری کے لیے کیا یہ بھی ضروری ہوگا؟
اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں
یہ نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا ــــ نہیں ہو سکتا
میں مداری تو نہیں ہوں کہ پٹاری لے کر
کھیل دکھلاتا پھروں شعبدہ بازوں کی طرح
میں تو خود اپنا پیمبر ہوں کہ میرے نغمے
میرے احساس کی تصویر ہوا کرتے ہیں
میرے شعلے تو مری روح کی آوازیں ہیں
کتنی کمظرفیِ فطرت ہے مری سوچ کہ میں
اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں
فاعلاتن، فعلاتن سے غرض کیا مجھ کو
قافیہ کیا، مری تخییل کو کوئی طاقت
پابجولاں نہیں کر سکتی غلاموں کی طرح

۲

کون کہتا ہے کہ اشعار ہیں میرے الفاظ
یہ تو اک خام خیالی ہے جہاں والوں کی

یں تو جو سنتا ہوں نظروں سے تری کہتا ہوں
یہ الگ بات ہے مفعول، فعولن، فعلن
یا فعولن، فعلاتن میں بیاں ہو جائے

قیدی

کوئی زنجیرِ گراں قید نہیں کر سکتی
سنگ و آہن کی بنائی ہوئی کوئی دیوار
تجھ کو آغوش میں، تا دیر نہیں رکھ سکتی
تیری فریاد ہے نہ زنجیرِ گراں کی فریاد
تیری دیوار میں پتھر کی نہیں سنگینی
تیرے دروازے میں لوہے کی سلاخیں ہیں کہاں
ایک آسودۂ اوہام، طلسمِ حبا مد
تجھ کو پابند کیے دیتا ہے، تو قید نہیں
تو ہے آزاد۔ کہ آزادِ شب و روز ہے تو

۲

یوں تو پابند ہیں ہر حال میں اہلِ بینش
آدمی کے لیے کیا قیدِ عناصر کم ہے!
ایک ہی گردشِ ایام کے سب قیدی ہیں
سانس بھی حلقۂ زنجیر سے کچھ کم تو نہیں
زندگی دیدۂ بینا کو ہے اک حبسِ دوام
تو نے زنجیرِ تخیل کی سنی ہے جھنکار
تیری زنجیر کی آواز سے کچھ کم تو نہیں
تیری تنہائی شب و روز کا پیمانہ ہے
آنکھیں سِل سکتی ہیں، لب بند بھی ہو سکتے ہیں

پر تجھے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا
تو ہے آزاد۔ کہ آزادِ شب و روز ہے تو

۳

مسکرا جیل کی دیواروں میں رونے والے!
تُو ہے آزاد۔ زرا سوچ کہ آزاد ہے تُو

تیری دیوار تو پتھر کی ہے۔ بےحس دیوار
جو مرے سامنے اک سایۂ بےمعنی ہے

لیکن افکار کی دیوار ہے میری دیوار
جس کو میرے ہی تخیّل نے بنایا ہے مگر
کوئی طاقت اسے مسمار نہیں کر سکتی

سرِ راہے

راہ پر چلتے ہوئے دل میں خیال آتا ہے
ہر قدم مجھ کو لیے جاتا ہے منزل کے قریب
میں ابھی اپنے شبستان میں پہنچ جاؤنگا

بھول جاؤنگا کہ یہ دن بھی کٹا مر مر کے
اور فاقوں کی ہلاکت میں بجھی تلواریں
میری ہر رگ میں لہو بن کے مچلتی ہی رہیں
بھول جاؤنگا کہ کمزور تھکی سانسوں نے
وقت کا ایک چراغ اور بجھا ڈالا ہے
زندگی سکوں میں ڈھلتی رہی، ڈھلتی ہی رہی

فلسفہ، شعر، محبّت کے ہزاروں دفتر
پیٹ کی آگ میں جلتے رہے، مجبور تھا میں
سینکڑوں سایے ابھرتے رہے نظروں میں مری

اور اب ایک ہی سایہ مرا ہمراہی ہے
ایک ہی سایہ مرے ذہن میں لرزاں ہے کہ میں
موت سے کتنا قریں ہوتا چلا جاتا ہوں

ہر قدم مجھ کو لیے جاتا ہے منزل کے قریب
میں ابھی اپنے شبستاں میں پہنچ جاؤنگا

غزل (لغوی اعتبار سے)

کہو! اک بات کہوں، کوئی سنیگا تو نہیں
تم سنوگی! ارے ہاں تم تو سنوگی، لیکن
سوچ لو، سن کے بُرا تو نہیں مانوگی اسے
تم بُرا مانوگی — میں جانتا ہوں، جانتا ہوں

خیر لو آؤ، سنو، آؤ — قریب آجاؤ
کوئی آجائیگا؟ — آئیگا، تو پھر کیا ہوگا!

پھر سہی، پھر سہی، جاؤ کوئی آجائیگا
اب کہوں؟ سوچ لو، میں تم سے کہے دیتا ہوں

نہیں مانوگی؟ نہیں مانوگی تم؟ مان بھی جاؤ
کیوں مجھے اپنی قسم دیتی ہو — ٹھہرو ٹھہرو

چھیڑتا ہوں؟ تمہیں میں چھیڑتا ہوں؟ خوب! چہ خوب!

اچھا تو آؤ، سنو — تم تو نہیں مانوگی
مانوگی؟ اچھا، کہے دیتا ہوں، میں نے کل رات
دل میں سوچا تھا کہ اب تم سے نہیں بولونگا

بھوک

بھوک زندہ رہے ۔ تاحشر یونہی زندہ رہے
کوئی آسودۂ آلام نہ ہونے پاتے
کوئی آرام سے، بیفکر نہ ہونے پائے
اس کی عظمت رُخِ ایام پہ تابندہ رہے۔

بھوک زندہ ہی رہے، جس کی حرارت کے سبب
آنکھیں کھل جاتی ہیں، ماحول بدل جاتا ہے
دل سے تعظیم کا احساس نکل جاتا ہے
پیدا ہو جاتے ہیں سب فکرِ معیشت کے سبب

بھیڑیے بپھرے ہوئے پھرتے ہیں انسانوں میں
جن کی پہچان اسی بھوک سے ہو جاتی ہے
آرزو خار شرافت کے چبھو جاتی ہے
اور پیوند نظر آتے ہیں دامانوں میں

بھوک مٹ جائے، تو یہ تیری محبت کی نظر
دو ہی دن میں خطِ بیکار نظر آنے لگے
ہم میں حائل کوئی دیوار نظر آنے لگے
میرے چہرے پہ بکھر جائے شکایت کی نظر

بھوک زندہ ہے تو احساس بھی تابندہ رہے
آرزو میری، تری چشمِ طلب، بھوک ہے، دیکھ!
بھوک ہے، سینۂ سوزاں میں جو اک ہُوک ہے، دیکھ!
بھوک سے میں ہی نہیں، تو بھی تو پائندہ ہے

باقی صدیقی، محمد افضل

راولپنڈی (پاکستان) سے کوئی تین میل کے فاصلے پر ایک مختصر سا قصبہ "سہام" ہے، وہیں ۲۰ دسمبر ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے۔ اگرچہ یہ خاندان قریشی تھا لیکن باقی نے صدیقی نسبت کو ترجیح دی۔ ابھی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اسی باعث تعلیم دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ کم عمری میں تلاشِ روزگار میں سرگرداں ہونا پڑا؛ اور کہاں کہاں کے کنوئیں نہیں جھانکے! پانچ سال تک دیہاتی مدارس میں بچوں کو پڑھاتے رہے جب بالکل عاجز آ گئے، تو قسمت آزمائی کو بمبئی پہنچے کہ شاید فلم میں کچھ کام ملے۔ تین برس یہاں رہے۔ دو ایک جگہ کام کیا لیکن کوئی مستقل صورت نہ بن سکی۔ اتنے میں دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی، تو فوج میں حوالدار کلرک بھرتی ہو گئے۔ دو سال بعد جنگ ختم ہوئی، تو اب بعض اور فوجی محکموں میں ملازمت مل گئی۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں والدہ کی وفات نے یہ سلسلہ بھی منقطع کر دیا، وہ استعفا دے کر گھر آ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ادبی محاذ پر کوشش شروع کی۔ شروع میں چندے راولپنڈی کے ہفتہ وار "راہِ منزل" میں ملازم رہے۔ سال بھر بعد ۱۹۵۱ء میں ریڈیو میں جگہ مل گئی۔ یہاں بھی بمشکل دو سال کام کیا تھا کہ تخفیف میں الگ ہونا پڑا۔

آغازِ شعر گوئی میں چندے سید عبدالحمید عدم سے اصلاح لی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ استاد کے لاابالی پن کے باعث یہ سلسلہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔ کلام کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ (۱) جامِ جم؛ (۲) دار و رسن؛ (۳) زخمِ بہار؛ (۴) بارِ سفر؛ (۵) شاخِ تنہا؛ (۶) زادِ سفر۔ آخری میں نعتیہ کلام ہے۔ وہ پنجابی میں بھی کہتے تھے۔ اس کا مجموعہ "کچے گھڑے" کے

عنوان سے چھپ چکا ہے۔

۸ جنوری ۱۹۷۲ء میں راولپنڈی میں رحلت کی۔

چونکہ زندگی میں کبھی آسودگی نصیب نہیں ہوئی، اس لیے ان کے کلام میں درد و سوز کی فراوانی ہے۔ اس پر تیکھے پن اور طنز نے اسے اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

شراب ناب پہ کشتی مری رواں تھی کبھی
کچھ اس طرح تری رحمت سفینہ راں تھی کبھی

ترے شگفتہ شگفتہ نقوشِ پا کے طفیل
مری نگاہ میں ہر راہ کہکشاں تھی کبھی

چمن چمن مری وحشت کا آشیانہ تھا
کلی کلی مری خوشبو سے گلستاں تھی کبھی

مری نگاہ سے تیرا غرور روشن تھا
تری نگاہ سے دنیا مری جواں تھی کبھی

جہانِ کفر و محبت میں میری بیتابی
قضا کا ناز تھا، اور زندگی کی جاں تھی کبھی

غمِ جہاں جو محیطِ حیات ہے، تو کیا
مری حیات محیطِ غمِ جہاں تھی کبھی

تجھے گلا ہے مری جانِ ناتواں سے مگر
ترا سہارا یہی جانِ ناتواں تھی کبھی

کبھی کبھی مجھے، باقیؔ! خیال آتا ہے
وہاں نہیں ہے مری زندگی، جہاں تھی کبھی

نہ اترا اے صیاد کی دوستی پر
اسی باغ میں تھا مرا آشیانہ

یہی جہاں تھا، یہی گردشِ جہاں تھی کبھی
وہ مہرباں تھے، تو ہر چیز مہرباں تھی کبھی

زندگانی کا سب مزہ، باقیؔ!
منحصر ہے فریب کھانے پر

کہہ رہی ہیں حضور کی باتیں
ختم ہونے پہ ہیں ملاقاتیں

کس کی راتیں، کہاں کی برساتیں
آپ کے ساتھ تھیں وہ سب باتیں

کچھ اس انداز سے اس فتنہ پرور کا پیام آیا
نہ دنیا میرے کام آئی، نہ میں دنیا کے کام آیا

آپ کی، یا جہاں کی بات کریں
کون سے مہربان کی بات کریں!

ہو چکیں اُس جہان کی باتیں
اب کوئی اِس جہاں کی بات کریں

ہونے کو اُن سے سینکڑوں باتیں ہوئیں مگر
جس بات کا گلا تھا، وہی بات رہ گئی

وسیم خیرآبادی، سیّد امیر احمد

متاخرین میں سید محمد عسکری ترمذی وسیم خیرآبادی کا نام ایسا غیر معروف نہیں کہ کسی تعارف کا محتاج ہو۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت سید حسین اصغر خلف امام چہارم زین العابدین سجاد سے ملتا ہے۔ سید حسین اصغر کے خاندان کے ایک صاحب سید علی مدینہ سے ہجرت کر کے ترمذ (ازبکستان) میں جا بسے تھے۔ ایک روایت ہے کہ ان کی اولاد میں سید احمد زاہد کا نکاح امیر ناصر الدین سبکتگین کی صاحبزادی شاہزادی گوہر تاج (یعنی سلطان محمود غزنوی کی علاتی ہمشیر) سے ہوا تھا۔ امیر سبکتگین کی وفات (ف ۹۹۶ء) کے بعد سید احمد زاہد اپنے خاندان اور اعزہ و اقارب کے ساتھ ہندستان چلے آئے اور پنجاب میں مقیم ہو گئے۔ یہاں امتیاز کے لیے خاندان کا نام سادات ترمذ مشہور ہو گیا۔ مدتوں بعد سید احمد زاہد کے ورثا میں سید مہر علی شاہ قلندر پنجاب سے نکلے اور خیرآباد (ضلع سیتاپور، یوپی) میں بس گئے۔ انھیں کی اولاد میں وسیم کے والد سید محمد مہدی تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے، غمگین تخلص تھا۔

وسیم ۱۸۵۷ء کی مشہور شورش سے پہلے پیدا ہوئے، ٹھیک سال معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ اس ہنگامے کے وقت میں سن شعور کو پہنچ چکا تھا۔ وسیم نے شعر گوئی ورثے میں پائی تھی۔ انھوں نے کلام پر اصلاح امیر مینائی (ف اکتوبر ۱۹۰۰ء) سے لی۔ وہ مدتوں استاد کے ساتھ رامپور میں رہے۔ امیر اللغات کی ترتیب و تدوین میں وہ امیر کے دست راست تھے۔ استاد کو ان کی زباندانی اور فنی مہارت پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اکثر اپنے مبتدی شاگردوں کو ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ امیر اللغات کے علاوہ نور اللغات کی ترتیب میں بھی ان کا حصہ کچھ کم وقیع نہیں تھا۔

وسیم تعلیم کی تکمیل کے بعد اوّلاً انگریزی حکومت کی ملازمت میں داخل ہوئے لیکن جلد ہی اس سے مستعفی ہو کر توکل علی اللہ خانہ نشین ہو گئے۔ جب ۱۸۹۰ء میں جونپور کے رئیس راجہ ہری ہردت سنگھ دُوبے رنگین ان کے شاگرد ہوئے، تو انھوں نے اصرار کر کے اپنے پاس بلا لیا اور اپنی زندگی بھر کہیں اور جانے نہیں دیا۔ جونپور کے دورانِ قیام میں انھوں نے یہاں سے ۱۸۹۴ء میں گلدستہ "گلچین" جاری کیا تھا۔ یہ پرچہ بعد کو خیرآباد اور لکھنؤ سے شائع ہوتا رہا، پھر بند ہو گیا۔ ایک زمانہ بعد انھوں نے اسے جنوری ۱۹۱۷ء میں سیتاپور سے شائع کرنا شروع کیا، اور اب اس میں نظم کے ساتھ نثری مضامین کا بھی اضافہ کر دیا۔

جب ۱۸۸۱ء میں مولوی سبحان اللہ خان رئیس گورکھپور کے بلائے ہوئے ریاض خیرآبادی گورکھپور گئے، تو موصوف کے ایما پر ریاض نے وسیم کو بھی وہاں بلا لیا۔ وسیم رشتے میں ریاض کے بہنوئی ہوتے تھے۔ وسیم یہاں مولوی سبحان اللہ خان کے کتابخانے کے نگران ہو گئے۔ یہ قیمتی کتابخانہ مولوی سبحان اللہ خان کی وفات کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو دے دیا گیا تھا اور آج کل آزاد لائبریری کا ایک حصّہ ہے۔ اسی زمانے میں وسیم کے ایک اور شاگرد نے "تحفۂ خوشتر" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، وسیم اس کی ترتیب میں بھی شریک رہے۔

بالآخر ۱۹۲۸ء میں خاکِ خیرآباد کی کشش نے وسیم کو وطن بلا لیا۔ یہ سفرِ آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کئی مہینے کی علالت کے بعد ۷ مارچ ۱۹۲۹ء (۲۴ رمضان ۱۳۴۷ھ) کو رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ اپنی قیامگاہ محلّہ شیخ سرائے کے متصل کی مسجد عسکری میاں کے صحن میں سپردِ خاک ہوئے۔ یہ مسجد بھی خود انھیں کے نام سے مشہور ہے، اگرچہ اسے ان کے جدّ امجد نے تعمیر کرایا تھا۔

سید امیر احمد اثیم انھیں وسیم کے خلفِ اکبر تھے، یہ جنوری ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان سے بڑی ایک بہن وارث فاطمہ تھیں اور چھوٹے ایک بھائی سید خلیل احمد۔ یہ دونوں بھی شعر کہتے تھے۔ وارث فاطمہ کا تخلص صنوبر تھا اور خلیل احمد کا شمیم۔ افسوس کہ شمیم

نے عنفوانِ شباب میں ۳ نومبر ۱۹۵۲ء (۱۴ صفر ۱۳۷۲ھ) کو انتقال کیا۔ اثیم نے تاریخ وفات کہی: اس لحد میں بسے شمیم بہشت (۱۳۷۲) اپنے والدِ بزرگوار کے پہلو میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ وارث فاطمہ کا سندیلہ میں عقد ہوا تھا۔ وہیں ۱۹ اگست ۱۹۵۴ء کو لاولد فوت ہوئیں۔

اثیم نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ جب استعداد قابلِ لحاظ ہوگئی، تو مدرسۂ نیازیہ خیرآباد میں بھیج دیے گئے۔ یہاں نقہ ان کا دل پسند موضوع تھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد منبع الطب کالج لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔ دو سال تک یہاں تحصیل کی تھی کہ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس سے وقتی طور پر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ شاید وہ طب کی تکمیل نہ کر سکیں۔ ہوا یہ کہ ان کے والد وسیم صاحب کسی کام سے راجہ صاحب محمود آباد کی ملاقات کو لکھنؤ آئے، تو بیٹے کے دیکھنے کو منبع الطب کالج پہنچے۔ دورانِ گفتگو میں کسی مناسبت سے انھوں نے بیٹے سے کسی شعر کے معنی پوچھے۔ بدقسمتی سے یہ تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ اس پر وسیم بگڑ گئے؛ بہت برہم ہوئے۔ فرمایا کہ یہاں تم ترقیِ معکوس کر رہے ہو۔ یہ کہا اور انھیں کالج سے اٹھا کے اپنے ساتھ واپس خیرآباد لے گئے۔ چندے بعد لوگوں کے بیچ بچاؤ سے انھوں نے اثیم کو معاف کر دیا، اور یہ واپس لکھنؤ چلے گئے۔ انھوں نے ۱۹۲۷ء میں طب کی تعلیم مکمل کی اور درجۂ اوّل میں پاس ہوئے۔ پھر اگرچہ انھوں نے خیرآباد میں یونانی دواخانہ کے نام سے اپنا مطب قائم کیا، لیکن خود نسخہ بہت کم لکھتے تھے؛ زیادہ تر مشہور مقامی حکیم انوار حسین صاحب کے نسخے ان کے پاس آتے تھے، جس سے اچھا خاصا کام چلتا رہا۔ بعد کو یہ مطب بھی بند ہو گیا۔

جب وسیم، مولوی سبحان اللہ خان کے بلاوے پر گورکھپور گئے ہیں، تو اثیم بھی والد کے ساتھ تھے۔ اس زمانے میں یہاں ریاض اور وسیم کے قیام کے باعث گورکھپور گویا شعر و سخن کا مرکز بن گیا تھا۔ اثیم بھی وہاں کسی مقامی کالج (یا اسکول) میں اردو اور فارسی کے مدرّس ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں وہ "گلچین" اور "تحفۂ خوشتر" کے معاون مدیر بھی رہے۔ جب زمانے نے گورکھپور کی بساط الٹی، تو اثیم اوّلاً صوبۂ بہار گئے۔ جب وہاں قدم

نہ جم سکے، تو حیدر آباد (دکن) کی راہ لی۔ ایک زمانہ بعد ۱۹۴۹ء میں واپسی ہوئی۔ ۱۹۵۰۔ ۱۹۵۱ء کا ایک سال وہ مدرسۂ نیازیہ، خیر آباد میں فارسی کے مدرّس رہے۔ پھر جولائی ۱۹۵۵ء سے فروری ۱۹۶۰ء تک مدرسۂ اشاعت العلوم، خیر آباد میں بھی یہی شغل رہا۔ خیر آباد سے اس زمانے میں جمال الدین اسیر انصاری کی ادارت میں ایک رسالہ "کاروان" شائع ہوتا تھا۔ انجم بھی اس کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ جب "کاروان" نے دم توڑ دیا، تو یہ کانپور پہنچے اور وہاں مدرسۂ ارشادیہ میں مدرّسی کر لی۔ دو سال بعد ۱۹۶۲ء میں وہیں کے ایک اور مدرسے احسن المدارس میں منتقل ہو گئے۔ کانپور سے ایک رسالہ "جھلک" نکلتا تھا۔ مدرّسی کے ساتھ یہ اس کی ایڈیٹری کے فرائض بھی سر انجام کرتے رہے۔ مدّتوں اس رسالے کی پیشانی پر انجم کا یہ شعر چھپتا رہا تھا:

جھلک دکھا کے محبّت سکھائی جاتی ہے
یہ آگ خود نہیں لگتی، لگائی جاتی ہے

آخری زمانے میں قیام بیشتر کانپور ہی میں رہا، اگرچہ خیر آباد کی ادبی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لیتے رہتے تھے۔ مثلاً ۱۹۵۷ء میں خیر آباد میں ایک "انجمنِ ادب" قائم ہوئی، تو وہ اس کے صدر بنائے گئے تھے۔ یہ انجمن زیادہ دن نہ چل سکی اور سال بھر بعد ختم ہو گئی۔

۱۳۹۰ھ میں رمضان کی چھٹیاں گزارنے کو وطن آئے۔ یہاں احباب اور بچوں کے اصرار پر کانپور کی واپسی ملتوی کر دی۔ اتنے میں بیمار ہو گئے۔ خدا خدا کر کے مہینوں بعد بخار نے پیچھا چھوڑا، تو اب اسہال کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہ عمر اور اس پر ایسے موذی مرض کا حملہ! کمزوری ہونا ہی چاہیے تھی۔ چند دن میں سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ علاج معالجے کے باوجود حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اسی میں ۶ اپریل ۱۹۷۲ء قبل دوپہر سوا گیارہ بجے کے قریب جان بحق ہو گئے۔ آخری الفاظ تھے: اوّل اللہ، آخر اللہ۔ نمازِ جنازہ درگاہِ مخدوم شیخ سعد میں ان کے دوست سیّد نجم الحسن رضوی نے پڑھائی اور بعدِ مغرب انھیں اپنے والدِ مرحوم کے قریب مسجد عسکری میاں کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔ مولوی نثار احمد فاروقی عارف خیر آبادی کے قطعۂ تاریخِ وفات کا آخری شعر ہے:۔

بر لوحِ مرقد، عارف! ایں سالِ وفاتش کن رقم
"روحِ ادب، کانِ صفا، سیّد امیر احمد نسیمؔ"

اولادِ جسمانی میں دو لڑکے (یقین احمد عرف انس میاں اور بشیر احمد) ان سے یادگار ہیں۔

انھوں نے کلام پر اصلاح اپنے والد وسیم مرحوم سے لی تھی، اور خود درجۂ استادی حاصل کیا۔ اس دور کے اکثر رسائل و جرائد میں ان کا کلام ملتا ہے۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی بہت لکھا اور اس میں بھی کسی سے ہیٹے نہیں تھے۔ خوشنویس بھی اچھے تھے۔ تلامذہ کی بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ افسوس کہ مجموعہ کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ تمام اصنافِ سخن میں وافر کلام ان کے اعزّہ کے پاس موجود ہے۔ جناب وصی سیتاپوری نے قدسی خیرآبادی صاحب کا مرتّبہ کچھ کلام مہیا کیا ہے، اسی سے مندرجۂ ذیل انتخاب پیش کر رہا ہوں:

رہے زندگی بھر محبّت کے بندے — نہ ہم دین سمجھے، نہ ایمان جانا
محبّت ذریعہ ہے قربِ خدا کا — نسیمؔ! اس کو ہی ہم نے ایمان جانا

آپ ہی ہم ہیں مدّعا اپنا — نہیں ملتا، ہمیں پتا اپنا
مدد اپنی اگر ہمیں نہ کریں — کام نکلے کسی سے کیا اپنا
تجربے یہ بتاتے ہیں کہ، نسیمؔ! — آسرا ہے تو آسرا اپنا

ہاں بہار آئی، آکے جا بھی چکی — بیدلوں کے دلوں کا کھلنا کیا
جان اگر جاتی ہے تو جائے نسیمؔ! — جو نہ ملتا ہو اس سے ملنا کیا

ہر پھر کے خود گرفتہ کوئی پھر کہیں گیا — سو بار کھا چکا تھا قسم، پھر وہیں گیا
اٹھا تو دل پکڑ کے، گیا دل کو چھوڑ کے — محفل سے جو گیا تری، اندوہگیں گیا
گو ہو چکی ہے یاد فراموش آپ کی — لیکن جو اضطراب تھا دل کا نہیں گیا

ایک میں ہوں کہ وفا پر بھی ندامت ہے مجھے — ایک وہ ہے کہ جفا کر کے پشیماں نہ ہوا

کام جتنا عقل نے عقدہ کشائی سے لیا — اور بھی سربستہ ہر رازِ نہاں بنتا گیا

جوہر دانش رہا مصروفِ عرضِ انکشاف ذہنِ انساں بندۂ وہم و گماں بنتا گیا
دینے والے کا کیا کریں شکوہ ہم کو حسنِ طلب نہیں آتا

ناز ہے شعلۂ سرکش کو بھی رعنائی کا ابھی دیکھا نہیں عالم تری انگڑائی کا
میری محفل، یہی نیرنگِ تصور میرا میری دنیا، یہی گوشہ مری تنہائی کا

اشکِ غم کی ہم سمجھتے ہی نہ تھے کوئی بساط یہ وہ قطرہ تھا، بڑھا، اور بڑھ کے دریا ہو گیا
جو نہ دنیا میں کسی کا ہو، کہیں کا وہ نہیں اس کو کچھ کھٹکا نہیں کسی کا ہو گیا
رہتے رہتے دل میں، اب تو غم کسی کا اے اثیم دل کا ارماں بن گیا، دل کی تمنا ہو گیا

بیگانگیِ دل کا نہ کچھ پوچھ ماجرا یہ آشنا ملا بھی، تو نا آشنا ملا
کوئی تو بات ہے کہ ملا جب کبھی اثیم اس کی گلی میں ہم کو بھٹکتا ہوا ملا

غم سے آزاد ہی نہ تھا گویا دل مرا شاد ہی نہ تھا گویا
دل کہ آباد ان کی یاد سے ہے کبھی برباد ہی نہ تھا گویا
عشق نے یوں مٹا دیا سب کچھ کچھ مجھے یاد ہی نہ تھا گویا
دل کی ویرانگی کوئی دیکھو کبھی آباد ہی نہ تھا گویا
جان دے دی، نہ اُف اثیم نے کی دمِ فریاد ہی نہ تھا گویا

اس نے دل و جگر جو لیے، کیا ہوا، اثیم! جو بھی ہمیں خدا نے دیا، سب اسی کا تھا

بالیدگیِ روح کا رکھتا نہیں اثر وہ قطرۂ سرشک، جو طوفاں نہ ہو سکا
کرتے ہو اس کے مشرب و ملت کا ذکر کیا کافر تو کیا، اثیم مسلماں نہ ہو سکا

سینہ تمام درد سے معمور ہو گیا سامانِ راحتِ دل رنجور ہو گیا

دل کے ہر گوشے میں ارمانوں کی اک بستی ہے ایک ہی ہوتا، مگر آپ کا ارماں ہوتا

زباں کوئی سمجھتا ہے، نہ اندازِ بیاں اپنا
شناسا ہی نہیں کوئی، خداوندا یہاں اپنا
یقیں تو ہے، مرے ہر دعوے کی تصدیق ہو جاتی
نہیں منظور ہے، افسوس، ان کو امتحاں اپنا

شکار آپ اپنی نادانی کے ہم ہیں اپنے ہاتھوں سے
نہ دشمن ہے زمیں اپنی، نہ دشمن آسماں اپنا

بغیر اس کے جینا ہے بیکار جینا — مگر زندگی ہے، تو ناچار جینا
جو دیوانگی ہو گزر جائے جوں توں — مگر عشق میں اس کے ہشیار جینا
نہیں عشق میں چین کی کوئی صورت — اک آزار مرنا، اک آزار جینا
اثیم! ایسے جینے سے مرنا ہی اچھا — کہ جینا، مگر با دلِ زار جینا

جب کام ہی تمام کیا اپنا درد نے — اب کیا بتائیں، درد کہاں تھا، کہاں نہ تھا

مجھے ان کے بھی نام ہیں یاد بہت، کبھی جن کا جہاں میں زمانہ رہا
وہ زمانہ فسانہ بنا تو؛ مگر نہ زمانہ رہا، نہ فسانہ رہا
تجھے جور و ستم کا مزا نہ رہا، ہمیں شکوۂ جور و جفا نہ رہا
نہ وہ تو ہی رہا، نہ وہ ہم ہی رہے، نہ وہ جوشِ جنوں کا زمانہ رہا
نہ تو قیس رہا، نہ تو لیلیٰ رہی؛ یہاں شیریں مری، گئی کوہکنی
نہ وہ شہرتِ حسن و جمال رہی، نہ ہی جوشِ جنوں کا زمانہ رہا
تمہیں ہو نہ خوشی، کوئی جو نہ مرے! تمہیں رنج نہ ہو، جو کوئی نہ جیے
تمہیں اپنے ہی کام سے کام ہے بس تمھیں کیا کہ رہا کوئی یا نہ رہا
نہ وہ درد رہا، نہ وہ سوز رہا، نہ وہ ٹیس رہی، نہ تڑپ ہی رہی
ہے اگرچہ اک آگ سی دل میں لگی، مگر آہ کہ اب وہ مزا نہ رہا
مری موت کو سن کے عدو نے کہا، کوئی غم تو نہیں ہے یہ غم ایسا
مجھے غم ہے اگر تو ہے غم اس کا، کوئی دہر میں اہلِ وفا نہ رہا

زندگانی میں شوق کی لہریں تو بھرو — بن ہی جائیگا یہ افسانہ فسوں آپ سے آپ
درد کی قدر حسین ہی نہیں ہو سکتی — ہاں تڑپ دل کی ہے رہ رہ کے فزوں آپ سے آپ

سنانے نکلا ہوں نغمۂ غم، میں دل فگاروں کو ڈھونڈتا ہوں
رباب اٹھا کر رباب میں مَیں شکستہ تاروں کو ڈھونڈتا ہوں

نہ حسنِ خوباں کی آرزو ہے، نہ جلوہ زاروں کو ڈھونڈتا ہوں
نظر کے دامن میں جو چھپے ہیں، میں ان نظاروں کو ڈھونڈتا ہوں
کھلے تو کیونکر کھلے حقیقت کہ مہر برلب سی ہے محبت
جو دل کے مضموں کی ہے عبارت، میں ان اشاروں کو ڈھونڈتا ہوں
جو اپنے مشرب کے لوگ ہوتے ہیں، ڈھونڈتی ہے انھیں کو دنیا
نثار کرتی ہے جان مجھ کو، میں جان نثاروں کو ڈھونڈتا ہوں
اثیم! میں جو شگفتہ خاطر، شگفتگی ہو انھیں مبارک
دلِ شکستہ لیے ہوئے ہوں، میں دلفگاروں کو ڈھونڈتا ہوں

شکوہ گردش کا آپ کو ہے اثیم! گوشۂ عافیت سے نکلے کیوں؟

کیا چیز یہ پُر خلوص یارانہ ہے کیا شے دو مخلصوں کا افسانہ ہے
بیگانہ وفا کرے، تو اپنا ہے، اثیم! اپنا نہ وفا کرے، تو بیگانہ ہے

بیفائدہ شغل، گھونٹ غم کے پینا بیکار سی بات، زخم دل کے سینا
دو بھر کتنی ہی زندگانی ہو، اثیم! جب تک نہ اجل آئے، ہے ازبس جینا

رکھنے کو تو رکھتے کتنے جوہر ہیں ہم
ناچیز ہیں، خاک کے برابر ہیں ہم
سب کچھ موقوف حسنِ ظن پر ہے، اثیم!
مانو، تو دیوتا! نہیں، تو پتھر ہیں ہم

علیم اختر مظفر نگری، محمد عبد العلیم صدیقی

ان کی ولادت ۶ جون ۱۹۱۴ء کو ضلع مظفر نگر کے قریب ایک قریہ حسین پور بسیڑہ میں ہوئی (اصل میں لفظ بسیرا ہوگا، جو مرورِ زمانہ سے دیہاتیوں نے بگاڑ کر بسیڑا بنا دیا) ان کے والد جناب محمد عمر (ف ۱۹۵۵ء) مدرسی پیشہ تھے؛ وہ ساری عمر مختلف مقامات پر صدر مدرّس رہے۔ علیم صاحب نے ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول، مظفر نگر سے دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ آگے تعلیم جاری رکھنے کے وسائل مفقود تھے، اس لیے اب تلاش معاش کی فکر ہوئی۔ ۳۶-۱۹۳۶ء میں ایک مقامی زمیندار کے ہاں کارندے مقرر ہو گئے۔ تین سال بعد ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی، تو فوجیوں کی ضروریات مہیا کرنے کی خاطر حکومت نے کمبل بافی کے کارخانے قائم کیے تھے۔ یہ کام بہت وسیع پیمانے پر ہوتا تھا۔ منڈی سے اُون کی خرید سے لے کر کمبل کے بُننے تک کا سارا کام سرکاری ملازموں کے ذمے تھا۔ علیم صاحب اس محکمے میں پچیس روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ اس سلسلے میں، وہ مظفر نگر، نرپڑا، امروہہ، جالسٹھ، کیرانہ وغیرہ مختلف مقامات پر کام کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ تنخواہ میں بھی ترقی ہوتی رہی۔ افسرانِ مجاز ان کے کام سے مطمئن تھے، اور یہ خود بھی سکون سے تھے کہ اب ستّر روپیہ مشاہرہ ملتا تھا۔ لیکن اواخر ۱۹۴۱ء میں بہتر ملازمت مل جانے کی وجہ سے یہ نوکری چھوڑ کر جنرل اسٹور کانپور چلے گئے۔ یہاں سے کٹنی تبادلہ ہوا اور وہاں سے ناگپور جانا پڑا۔ ناگپور میں تھے کہ یرقان کا شدید حملہ ہوا۔ اس پر سولہ مہینے کی طویل رخصتِ علالت لینا پڑی جس کے باعث ملازمت سے جواب مل گیا۔ ۱۹۴۶ء میں تندرست ہونے کے بعد وہ وطن آ گئے، تاکہ یہاں

کنٹرولر جنرل کے دفتر سے دوبارہ ملازمت کا حکمنامہ حاصل کر سکیں، مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بسراوقات کے لیے دلّی کے قیام کے زمانے میں یہاں کے مختلف رسائل میں روزانہ تھوڑا تھوڑا وقت کام کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۴۸ء میں مستقل طور پر ماہنامہ شمع کے دفاتر میں ملازم ہو گئے۔ اس ادارے کے دونوں پرچوں (شمع اور شبستان) کی تقسیم و اشاعت اور دفتر سے متعلق قانونی کام کاج انھیں کے ذمّے تھے۔

پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء میں ان پر دل کا دورہ پڑا۔ اسپتال میں چند ہفتے رہ کر گھر آ گئے، کہنے لگے: یونہی ڈاکٹروں نے ڈرایا اور ہلکان کیا، صرف فشارِ دم کا عارضہ ہے۔ لیکن یہ محض نفس کا دھوکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے احتیاط سے ہو گئے۔ دوسرا حملہ کبھی اچانک ہوا اور یہی جان لیوا ثابت ہوا۔

جمعے کے دن ۲۱ اپریل ۱۹۷۲ء صبح کے وقت حسبِ معمول دفتر گئے۔ یکایک سینے میں درد کی شکایت کی۔ ہمدرد نرسنگ ہوم، شمع کے دفتر کے پڑوس میں ہے؛ وہاں پہنچایا گیا، بیوی بچے بھی پہنچ گئے۔ ان سے بات چیت کرنے لگے۔ معاملے کی نزاکت کا کسی نے احساس نہ کیا۔ باتیں کرتے دوپہر کے قریب رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی — انا للہ وانا الیہ راجعون — اسی شام درگاہ باقی باللہ میں تدفین عمل میں آئی۔

اولاد میں چار لڑکے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے عظیم اختر حکومتِ ہند کے محکمۂ اطلاعات میں ملازم ہیں، چھوٹے تینوں ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔

شعر میں انھیں تلمّذ ظالم مظفر نگری (ف ۱۹۶۹ء) سے تھا، اگرچہ زیادہ تر استفادہ سیماب اکبرآبادی مرحوم سے کیا۔ کلام کا مجموعہ "نکہتِ گل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (دلّی ۱۹۵۷ء)۔ اس پر یو پی حکومت نے انعام بھی دیا تھا۔ ایک مختصر سا مجموعۂ قطعات (مصوّر) بچوں کے لیے "پھول پتے" کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں خود شائع کیا تھا، جس میں سہل اور سادہ زبان میں سبق آموز قطعات شامل ہیں۔ ایک مجموعۂ نعت "انوارِ حرم"، بچوں کے لیے دوسرا مجموعۂ نظم "گل بوٹے" اور "بوئے گل" (دیوانِ غزلیات)

مرتب شدہ غیر مطبوعہ چھوڑے۔

میں انھیں پچھلے ۲۰-۲۲ برس سے جانتا تھا۔ بڑے مخلص اور بے ریا دوست تھے۔ حال آں کہ بیحد مذہبی آدمی، اور صوم وصلوٰۃ بلکہ اوراد و وظائف تک کے پابند اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (ف ۱۹۵۷ء) سے بیعت تھے۔ لیکن طبیعت میں عبوست نہیں تھی؛ اس کے برعکس ان کی گفتگو میں شگفتگی اور بذلہ سنجی کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ میں نے انھیں کبھی بیماری کی حالت میں بھی غمگین اور گرفتہ خاطر نہیں دیکھا۔ دعا ہے کہ اسی طرح خوشی خوشی وہ اپنے خالق کے حضور میں بھی حاضر ہوئے ہوں۔ آمین!

اعجاز صدیقی نے مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخِ وفات میں گویا ان کی پوری سیرت بیان کردی ہے:

اکیس اپریل، جمعہ ظہر کا وقت — طے بہ عجلت کیا عدم کا سفر
کرگئی آ کے خود اذانِ مرگ — بے نیازِ رکوع و سجدہ و سر
صرف پنجاہ وہشت سال تھی عمر — زندگی اس کی تھی مثالِ شرر
دردِ دل نے کچھ ایسی کروٹ لی — کرسکے کچھ نہ اس کے چارہ گر
شاعرِ نغز گو، ادیبِ شہیر — عابدِ خوش مذاق و نیک سیر
خوب ہنستا رہا، ہنساتا رہا — اپنے غم کی نہ دی کسی کو خبر

دل کے ہاتھوں ہی لٹ گیا، اعجاز!
"شاعرِ دل زدہ علیم اختر"
(۱۹۷۲)

علیم اختر مرحوم کے مجھ سے بہت یگانگت کے تعلقات تھے۔ انھوں نے میرے نام کا سجع بھی کہا تھا:

از بس کہ میرا نام بھی اللہ کا اک نام ہے
کیوں فکر ہو، اختر! مجھے جب میرا مالک رام ہے

انھوں نے اپنی وفات سے چند مہینے قبل اپنے دوسرے (غیر مطبوعہ) دیوان "بوئے گل" کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا نسخہ بطور ہدیہ مجھے دیا تھا۔ مندرجۂ ذیل انتخاب اسی

دیوان سے ہے۔ ان کا پہلا دیوان "نکہتِ گل" شائع ہو چکا ہے، اور بازار میں دستیاب ہے۔

آپ سے دوستی کیے نہ بنی — ہم سے یہ دشمنی کیے نہ بنی

اللہ اللہ، یہ تجدیدِ رہ و رسمِ ستم — مائلِ لطف و کرم یارِ دگر ہے کوئی
عشق اس وادیٔ حیرت سے گذر جاتا ہے — کوئی منزل نہ جہاں راہگذر ہے کوئی

رہتا ہے اداس اداس، پھر دل — کیا پھر کوئی بات ہو گئی ہے
اے مرگِ محبّت! آج تجھ سے — تکمیلِ حیات ہو گئی ہے

غم سے بھی بے نیاز، خوشی سے بھی بے نیاز — کیا کشتگانِ غم کا بنایا گیا ہے دل
تیری جفا نے حوصلۂ غم بڑھا دیا — ظلم و ستم سے دادِ وفا پا گیا ہے دل

اے فرطِ اضطرابِ محبّت! خبر نہیں — دل بیقرار ہے کہ نظر بیقرار ہے

ہائے، وہ غم کی منزلِ دشوار — عشق کو بھی شکستہ پا دیکھا
اور بھی دور ہو گئی منزل — ہم نے جب کوئی آسرا دیکھا

اب بار بار ان کی ندامت کا ہے خیال — اٹھنے کو اٹھ تو آئے ہیں اس انجمن سے ہم

اب ان سے کوئی رسمِ ملاقات نہیں ہے — اور بات ہے اتنی کہ کوئی بات نہیں ہے
اب خودنگہِ ناز ہے بیتابِ گزارش — کیا جانیے، کیا بات ہے، کیا بات نہیں ہے

کسی کا وعدۂ فردا، وفا تو کیا ہو گا — یہ فکر ہے کہ وفا ہو گیا، تو کیا ہو گا!
بلند بانگ ارادوں کے باوجود، انسان — خود آدمی بھی نہیں بن سکا، تو کیا ہو گا!
وہ اک خلش ہے کہ جسے آرزوئے شوق کہیں — جو بن گئی وہی خود مدّعا، تو کیا ہو گا!
فسانۂ غمِ ہستی سنا تو دوں، لیکن — جبینِ ناز پہ بل آ گیا، تو کیا ہو گا!

وہ پشیمان نگاہی، وہ جمالِ رعنا! — ایک رنگ آئے ہے، اک رنگ اتر جائے ہے
اے زہے کاہشِ غم، تابشِ رعنائیٔ شوق! — زندگی ہے کہ بہر طور، سنور جائے ہے

غمِ حیات، غمِ جاوداں نہیں ہوتا — غمِ حیات مگر زندگی پہ بھاری ہے
ہزار عیش و مسرّت کے باوجود، اختر! — وہ کون ہے کہ جسے غم سے رستگاری ہے

وہ فرطِ کیفِ بادہ، وہ انفاسِ عطر بیز — وہ نکہتِ تمام، وہ بوئے سمن کی بات

اک بزمِ سوگوار، مری شامِ انتظار — اک عشرتِ تمام، تری انجمن کی بات

خوشا کہ شام سے پیدا ہیں صبح کے آثار — ابھر رہی ہے سنہری کرن، سبو لاؤ

اوروں کے گلستاں سے کیا مطلب! — کیوں نہ اپنے چمن کی بات کریں

فرصتِ فکر و فن کسے، اختر! — اب کہاں فکر و فن کی بات کریں!

کھلے ہیں حسرت و ارمان و آرزو کے کنول — کلی کلی چمنِ دل کی مسکرائی ہے

مسرتوں نے تو بیخوابِ آرزو رکھا — دلوں کو سایۂ غم ہی میں نیند آئی ہے

وہ ارماں جو نہ نکلے دشمنی سے — نکالے جا رہے ہیں دوستی سے

مبارک، ترکِ رسم و راہِ الفت — مگر یہ آنکھ میں آنسو ابھی سے!

علیم اختر! یہ آخر بات کیا ہے؟ — نہ کچھ کہنا، نہ کچھ سننا کسی سے!

دل میں کیوں اک ہوک اٹھی ہے — کیا پھر کوئی بات ہوئی ہے!

دل کی بازی، اللہ اللہ! — جیت کبھی اکثر ہار ہوئی ہے

نگہِ شوق کو رہ رہ کے گماں ہوتا ہے — ان سے پہلے کبھی ملاقات ہوئی ہو جیسے

پھر وہ کیفیتِ دل، ترکِ ملاقات کے بعد — ہائے، ہر شے میں کسی شے کی کمی ہو جیسے

ویسے تو نہ آنے کے بہانے ہیں ہزاروں — ہاں، یاد نہ آنے کی کبھی تدبیر تو دیکھو

وہ عرضِ غمِ شوق پہ خاموشیِ پیہم — آہنگِ دل آویزیِ تصویر تو دیکھو

اس طرح چپ ہوں کوئی بات ہوئی ہو جیسے — کسی جنگل میں کہیں رات ہوئی ہو جیسے

ہائے، یہ عیش و مسرت، یہ خوشی کا عالم — غمِ دوراں سے ملاقات ہوئی ہو جیسے

مل کے اب ان سے یہ محسوس ہوا ہے اختر! — مفلسی میں بسر اوقات ہوئی ہو جیسے

کس کے غم میں خراب ہو؟ اختر! — کون ہے وہ، کسی کا نام تو لو!

وہ اک نظر کہ جسے التفاتِ ناز کہیں — اس اک نظر نے فسانے بنائے ہیں کیا کیا

ستم و جورِ گاہ گاہ نہیں — ان سے اب کوئی رسم و راہ نہیں

یا انھیں رخصتِ جمال نہ تھی — یا ہمیں فرصتِ نگاہ نہیں

کون لیتا ہے خبر سوختہ سامانوں کی! کسے معلوم کہاں خاک ہے پروانوں کی!

اٹھ کے محفل سے تری جانے کہاں پہنچے ہیں اب تو آواز بھی آتی نہیں دیوانوں کی

شوق کس منزلِ پُرکیف پہ لے آیا ہے شوق اپنا ہے نہ کچھ فکر ہے بیگانوں کی

بات بڑھ کر تری مستیِ نظر تک پہنچی گفتگو چھڑ گئی رندوں میں جو میخانوں کی

وصل ہی شادکامِ شوق نہیں شبِ غم میں کبھی دلکشی سی ہے

وہ نہ جب تک ملے رہا احساس زندگی میں کوئی کمی سی ہے

جسمِ آدم پہ ہے زرتار لباسِ اخلاص آدمیت ہے مگر لاشۂ بے گور و کفن

اب مرے نقشِ کفِ پا ہیں نشانِ منزل کام آ ہی گیا شوق کا دیوانہ پن

نگہِ شوق کی بیگانہ روی کے صدقے ان دنوں میری وفا کو ہے تلاشِ دشمن

کیا تماشائے نظر ہیں یہ ترے دیوانے کبھی نمناک نگاہی، کبھی ابرو پہ شکن

رہروِ راہِ محبت! رہگزارِ عشق میں جو ٹھہر جائے ہے گردِ کارواں ہو جائے ہے

جلووں سے ترے انجمنِ دل ہے منوّر آنکھوں کو مگر دید کے ارمان رہے ہیں

کیا ہے، جو ترے لطف پہ نازاں ہے کوئی آج ہم بھی کبھی شرمندۂ احسان رہے ہیں

جب گماں حد سے گزر جائے، تو ہوتا ہے یقین کیا یقیں سنگِ سرِ منزلِ اوہام بھی ہے

نگہِ لطف کا پردہ ہے تغافل، اختر! یہی اندازِ بھری بزم میں الزام بھی ہے

شاید اک دوسری تقدیر نمایاں ہو جائے اپنے ماتھے کی لکیروں کو مٹا بھی دیکھو

نارسائی میں ہے اک عہدِ مسلسل کا پیام ظلمتوں میں جو چھپی ہے، وہ ضیا بھی دیکھو

کوئی ہمدم ہے، نہ دمساز، نہ کوئی آواز راہ میں حوصلۂ آبلہ پا بھی دیکھو

اختر! اس میں تو کہیں ذکر نہیں ہے اُن کا یہ فسانہ انھیں اک روز سنا بھی دیکھو

تعجب ہے کہ مجھ سے پوچھتے ہو علیم اختر! تجھے کیا ہو گیا ہے؟

کوئی آہٹ بھی نہیں ہے، کوئی دستک بھی نہیں شوقِ بیتاب مگر جانبِ در دیکھے ہے

کچھ تو ہے، ہم جو تری بزم میں آتے ہی نہیں کبھی آتے ہیں تو آ جاتے ہیں، آتے جاتے

فاصلوں کا بھی تعین نہیں ہونے پاتا راستے کتنے بدل جاتے ہیں، آتے جاتے

خود فریبی کا بُرا ہو کہ خود اپنی تحریر
ایسے لگتا ہے کہ یہ خط مرے نام آیا ہے
وہ ترا وعدۂ فردا کہ جو ایفا نہ ہوا
وہی وعدہ، دلِ پُرشوق کے کام آیا ہے
دن تو موہوم امیدوں کے سہارے گزرا
اب کہیں جا کے ترا وعدۂ شام آیا ہے

جلالِ آزادی

(۱)

ہر اک نگاہ کو تھی جستجوے آزادی
ہر اک زبان پہ تھی گفتگوے آزادی
دلِ عوام میں برسوں رہی کسک بن کر
بقدرِ شوق و وفا آرزوے آزادی

(۲)

فضائیں گونج اٹھا: "انقلاب زندہ باد"
یہ کس نے چھیڑ دیا ہے ربابِ آزادی
جھلک رہی ہے شہید دل کے خون کی سرخی
مہک رہا ہے چمن میں گلابِ آزادی

(۳)

جلالِ بادشہی، سطوتِ جہانبانی
مری نگاہ تھی آیینہ دارِ آزادی
نشانِ جادۂ منزل تھا میرا نقشِ قدم
چلی تھی ساتھ میں خود رہگزارِ آزادی

(۴)

یہ سوچتا ہوں مرا عزم شوق ہی تو نہیں
یہ ایک راہبرِ تیز گامِ آزادی
مرے خلوصِ وفا کی حکایتیں ہی نہ ہوں
یہ ایک نامۂ رنگیں بنامِ آزادی

(۵)

اگست کی یہ پندرھویں کہ جس میں پنہاں ہے
عروجِ نقطۂ صد ماہ و سالِ آزادی
جھٹک کے دامنِ رنگیں سے گردِ محکومی
لیے ہوئے ہے جلوسِ جلالِ آزادی

ظفر، سراج الدّین ظفر

ظفر دراصل ان کا تخلص نہیں تھا، بلکہ جُزوِ عَلَم تھا؛ ماں باپ نے یہ نام خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار سراج الدّین ظفر کے نام پر رکھا تھا۔ اسی لیے جب بعد کو انھوں نے شعر کہنا شروع کیا، تو تخلص کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ ۲۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو جہلم (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان گکھڑ کہلاتا ہے۔ ان کے دادا گکھڑوں کی شاخ اسکندر آل کے شیخ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ گکھڑ قوم ایرانی الاصل ہے۔ واللہ اعلم۔
ان کے والد محمد عبدالقادر صاحب ریل کے محکمے میں انجینیر تھے۔ ان کی والدہ مسز (زینب) عبدالقادر اردو حلقوں میں افسانہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور رہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے ناول راہبہ، صدائے جرس، وادیِ قاف، لاشوں کا شہر، وغیرہ خاصے مشہور رہیں۔ اور زمانے کا مذاق بدل جانے کے باوجود آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔ مسز عبدالقادر کو تصنیف کا شوق اپنے والد مولوی فقیر محمد (یعنی ظفر کے نانا) سے ملا۔ مولوی صاحب موصوف دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی دینیات سے متعلق متعدد مصنّفات موجود ہیں۔ "حدائق الحنفیہ" ان کی مشہور تصنیف ہے۔ کوئی پچاس برس تک وہ ایک پرچہ "سراج الاخبار" بھی نکالتے رہے تھے۔
ظفر نے ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے دو سال بعد وکالت کی سند (ایل ایل بی) لا کالج، لاہور سے حاصل کی (۱۹۳۵ء)۔ انھوں نے اوّلاً وکالت ہی کا پیشہ بسر اوقات کے لیے اختیار کیا، لیکن اس میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے اسے ترک کر کے دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں فوج کے ہوائی

شعبے میں ملازمت کرلی۔ اس زمانے میں انھوں نے برما کے محاذ پر جاپان کے خلاف جنگ میں حصّہ لیا۔ وہ اس محکمہ میں دس برس رہے، لیکن یہ ملازمت بھی بھاری پتھر ثابت ہوئی۔ جنگ کے خاتمے پر وہ اس سے الگ ہو گئے؛ اس وقت گروپ کیپتان کے عہدے پر فائز تھے۔ اب سب طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے ۱۹۵۰ء میں تجارت کی طرف رُخ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا لاہور اور کراچی کے مشہور ناشرِ کتب مولوی فیروز دین (صاحبِ فیروز سنز) کی صاحبزادی (بشیرہ) سے نکاح ہوا تھا۔ مولوی صاحب موصوف نے ان کی ڈانواں ڈول حالت دیکھ کر انھیں اپنے ادارے میں جگہ دے دی۔ اس کے بعد ان کی معاشی تنگ و دَو اور پریشانی کا دور گویا ختم ہو گیا، اور اب وہ خاصی کامیاب زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گئے۔

انھیں آخری چار پانچ برس دردِ شقیقہ کی شکایت رہی۔ جب اس کا دورہ پڑتا تھا، تو اتنا شدید کہ وہ بالکل از کار رفتہ ہو جاتے تھے۔ علاج میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن بےسود؛ نہ صرف اس سے کوئی افاقہ نہ ہوا، بلکہ روز بروز حالت بگڑتی ہی گئی۔ دماغ کی تمام رگیں متورم ہو گئی تھیں اور اس کا اثر دل تک پہنچ گیا تھا۔

جس علمی اور ادبی ماحول میں وہ پیدا ہوئے تھے، اس میں ان کا تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہو جانا قدرتی امر تھا۔ وہ بہت ابتدا میں شعر کہنے لگے تھے۔ اگرچہ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے اس میں کسی سے مشورہ نہیں کیا، نہ کسی سے اصلاح لی، لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ شروع میں انھوں نے ضرور سیماب اکبر آبادی سے اصلاح لی۔ ممکن ہے، بعد کو مشورہ لینا ترک کر دیا ہو۔ شعر کے علاوہ انھوں نے افسانے بھی لکھے۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ "جنّت ایکسپریس" دورانِ جنگ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ریاکار مذہبی حلقوں کے بارے میں طنزیہ افسانے ہیں۔ دوسرا مجموعہ "آیئنے" کے عنوان سے چھپا (۱۹۴۳ء)۔ غزلوں کا پہلا مجموعہ زمزمۂ حیات ۱۹۳۶ء میں اور دوسرا "غزالِ غزل" فیروز سنز کی طرف سے مارچ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس پر انھیں مارچ ۱۹۶۹ء میں صدرِ مملکت کی طرف سے "آدم جی ادبی انعام" (پانچ ہزار روپے) عطا ہوا۔ انھوں

نے کسی زمانے میں بچوں کی درسی کتابیں بھی خاصی تعداد میں لکھی تھیں۔ سنا ہے کہ انگریزی میں بھی شعر کہتے تھے، اگرچہ یہ میری نظر سے نہیں گزرے۔

انھیں لغت اور صرف ونحو سے بھی غیر معمولی شغف تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ نئی نئی ترکیبیں وضع کرتے اور انھیں اپنے شعروں میں استعمال کرتے۔ اس سے ان کے کلام میں بانکپن اور ایک طرح کی تازگی اور سرمستی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

انھیں علم نجوم اور جفر میں بھی غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ وہ اکثر اپنی پیشگوئیاں اخباروں میں شائع کر دیتے تھے؛ اور حیرت ہے کہ ان میں سے بیشتر صحیح ثابت ہوئیں۔

ان کی زندگی "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی عملی تفسیر تھی۔ انھوں نے مقدور بھر اپنی شمع حیات دونوں سروں سے جلائے رکھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ ان کی شاعری میں لذتیت اور ابیقوریّت کی جو فراوانی ہے، تو یہ نہ محض سخن گسترانہ بات ہے، نہ شاعرانہ مبالغہ۔ انھوں نے ایک شعر میں اپنی زندگی کی تصویر یوں کھینچی ہے:

ہم سا رندِ باکرامت، کیا کوئی ہوگا کہ ہم دن کو درویشی کریں، راتوں کو سلطانی کریں

اور یہ امرِ واقع ہے۔ باکرامت درویشی کا یہ عالم تھا کہ واقعی دن بھر اصحابِ علم کی صحبت میں تصوّف اور اخلاق کے مسائل پر مصروفِ سخن رہتے۔ بیسیوں نادار اور عسیر الحال ادیب اور شاعر ان کے وظیفہ خوار تھے۔ متعدد غریب طالب علم ان کی فیاضی کی بدولت تعلیم پا کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔ جب بھی ان میں سے کوئی صاحب ان سے ملنے کو آجاتے، تو وہ ان کی پذیرائی میں بچھے جاتے۔ لیکن شام ہونے کے ساتھ ہی ان کی قلب ماہیّت ہو جاتی؛ اب ان کی شخصیّت ایک دوسرے رُوپ میں جلوہ گر ہوتی اور وہ اپنے اس شعر کی تصویر بن جاتے:

فرشِ گل بچھوائیں، رنگ و بو کی ارزانی کریں آؤ، بلقیسانِ دوراں سے سلیمانی کریں

ان کے کلام میں شکوہ ہے۔ انھوں نے مختلف رنگین ترکیبوں کے پردے میں تلذذ اور نشاط ہوس کی باتیں ایسے دلکش انداز میں کی ہیں کہ شاید عام حالات میں نظر ان کی گہرائی تک نہ پہنچے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

عرشِ خُم سے شراب اترتے دیکھی روحِ مہ و آفتاب اترتے دیکھی
میخانے کی اصلاح نہ دیکھی گو یہاں ہر روز نئی کتاب اترتے دیکھی

وہ میں تھا ہوشوں سے سلامت گذر گیا یہ تجربہ کرو نہ کسی پاکباز پر
یوں زندگی پہ میری نظر ہے کہ جس طرح اک جسمِ مرمریں کے نشیب و فراز پر

عشق ہو عشق، تو دوری میں بھی ہے لذّتِ خاص اس کا امکاں کہ یہ دوری کبھی کم ہو، نہ سہی
سجدۂ شوق غنیمت ہے، جہاں ہو جائے اس میں یہ شوق کہ محرابِ حرم ہو، نہ سہی

ہر ایک چیز جواں تھی جو آج صبح کو ہم کنارِ شاہدِ نوخیز و نوجواں سے اٹھے
اِدھر غزالِ حرم ہیں، اُدھر بتانِ کُنشت ہے کشمکش میں قیامت کہ اب کہاں سے اٹھے

میخانے سے چلی تھی کوئی بیخودی کی بات آ کر حرم میں کشف و کرامات ہو گئی
اُتری نہ تھی سُبو میں، تو کچھ بھی نہ تھی شراب اتری سبو میں، معرفتِ ذات ہو گئی

غمِ جہاں کہ بلا ہو گیا ہے سب کے لیے مرے سپرد کرو اس کو ایک شب کے لیے
دراز دست ہی پہنچے یہاں مرادوں کو نہیں یہ دولتِ زلفِ دراز سب کے لیے

آساں نہیں تلاشِ حریمِ جمالِ دوست کچھ دن جلاؤ شمعِ مہ و آفتاب اور

جانیے، کیا کیا مدارج اور ابھی کرنے ہیں طے ہم ابھی ذہنِ خداوندی میں اک اندیشہ ہیں
خشت و سنگِ ناتراشیدہ سے ابھرا خطِ حسن میگساروں کی نگاہیں ہیں کہ ضربِ تیشہ ہیں

بت پرستی کیجیے اس شدّتِ احساس سے سنگ میں بھی جزوِ احساس و خبر رکھ دیجیے

آیا نظر جہاں کوئی بھٹکا ہوا غزال ہم بھی بڑے خلوصِ دلی سے بھٹک گئے

کھینچی اگر، تو ہوش میں کھینچینگے زلفِ دوست منظور بیخودی کا سہارا نہیں ہمیں

زاہد کو خانقاہ میں ملتی کہاں شراب لیکن کچھ اہتمامِ رسد ہم نے کر دیا

ہر ایک قطرہ ہے میری نگاہ میں بحرِ شعور ہر ایک ذرّہ ہے دنیائے آگہی مجھ کو
پہنچ کے پردۂ اسرار تک میں لوٹ آیا نہ تھی پسند ملائک کی ہمرہی مجھ کو

اس کے سوا کچھ اور نہیں رازِ کائنات اک ذرۂ جمال برافروختہ ہوا

اسرارِ زندگی سے جو پردہ اٹھائیں ہم اپنے سوا کسی کو نہ موجود پائیں ہم

وہ پردۂ اسرار ہو، یا پردۂ محمل ہاتھ اپنے پہنچ جائینگے بے اذن وصلا بھی
میں گردشِ ایام پہ مرتا ہوں کہ اس میں خوشبو بھی تری ہے، ترے انداز و ادا بھی
دیکھا ہے، ظفر! تجھ کو خرابات میں ہم نے تجھ کو بھی ہے دعویٰ کرامت، ارے! جا بھی

اربابِ نظر دیکھے، پیرانِ حرم دیکھے رندوں کی طرح لیکن، پہنچے ہوئے کم دیکھے
خلوت میں نہیں جن سے امیدِ کرم کوئی جلوت میں کوئی ان کا اندازِ کرم دیکھے

آنکھیں کھلی ہیں اور زباں پر ہے قفلِ ضبط یہ حکم ہے کہ دیدہ وری کی زکات دے
اے دوست! اس زمان و مکاں کے عذاب میں دشمن ہے جو کسی کو دعائے حیات دے

نہ پوچھو شوق کا عالم کہ شہرِ خوباں میں ملا جو شخص، ہوا مجھ کو آشنا معلوم
نیاز کا ہے یہ عالم کہ جب خدا نہ ملا ہمیں پرستشِ بت بھی ہوئی بجا معلوم

یارب! کبھی نہ طے ہو مری راہِ اشتیاق جو بھی قدم اٹھے، قدمِ اوّلیں رہے

اب دل کے زیاں پر ہو سرِ نقد و نظر کیا اب ان سے گریزاں ہو تو ہے دل کا زیاں اور

آیا نہ میرے ہاتھ جو وہ شاہدِ مراد اپنے ہی اشتیاق سے میں ہم بغل ہوا

پھر پریشاں ہو کوئی زلفِ سمن بو اور ہم رات بھر تحقیقِ اسبابِ پریشانی کریں

اُدھر یہ دیر قیامت میں تھی کہ ہُو کرتے ادھر سے مغبچے دوڑے سبو سبو کرتے
مقابلے میں جو آتی تو ہم سے دستِ دراز خراب گردشِ دوراں کی آبرو کرتے
ہم اس جہاں میں تھے کل شب کسی کے ساتھ کہ لوگ صبا کی طرح بھٹکتے جو جستجو کرتے
ہمارے دوش پہ کھلتی، تو تیری زلف سے ہم نسیمِ صبح کے لہجے میں گفتگو کرتے

خلوتِ شب میں جو در پئے ہو زلیخائے بہار ہم نہیں یوسف کہ عذرِ پاک دامانی کریں
کہاں کے دیر و حرم، آؤ ایک سجدۂ ہوش بیادِ ہوش ربایانِ بست سالہ کریں

عکسِ جمالِ یار بھی کیا تھا کہ دیر تک / آئینے طوطیوں کی طرح بولتے رہے
کیا کیا تھا حلِ مسئلۂ زندگی میں لطف / جیسے کسی کا بندِ قبا کھولتے رہے
تا صبح جبرئیل کو ازبر تھا حرف حرف / راتوں کو جو سرود میں ہم بولتے رہے
کل شب ہمارے ہاتھ میں جب تک سبو رہا / اسرارِ کتم راز میں پر تولتے رہے
ہر چند شب سیاہ تھی لیکن شراب سے / ہم اس میں نورِ صبحِ ازل گھولتے رہے
ہم متقیِ شہرِ خرابات، رات بھر / تسبیحِ زلفِ ماہوشاں رولتے رہے
کل رات میکشوں نے توازن جو کھو دیا / خطِ سبو پہ کون و مکاں ڈولتے رہے

میں نے کہا کہ حل معمائے جاں کرو / اس نے کہا، یہ رات سپردِ بتاں کرو
میں نے کہا، بہارِ ابد کا کوئی سراغ؟ / اس نے کہا، تعاقبِ لالہ رخاں کرو
میں نے کہا کہ یوسفِ دل ناخریدہ ہے / اس نے کہا کہ نذرِ زلیخا وشاں کرو
میں نے کہا کہ فاصلۂ شوق ہے عظیم / اس نے کہا، شراب سے طیِّ مکاں کرو
میں نے کہا، کشائشِ مشکل ہو کس طرح؟ / اس نے کہا، وظیفۂ اسمِ بتاں کرو
میں نے کہا کہ صرفِ دلِ رائگاں ہے کیا؟ / اس نے کہا کہ آرزوئے رائگاں کرو
میں نے کہا کہ عشق میں بھی اب مزا نہیں / اس نے کہا کہ از سرِ نو امتحاں کرو
میں نے کہا کہ بابِ مشیئت میں کیا ہے حکم؟ / اس نے کہا، نہ اس میں چنیں و چناں کرو
میں نے کہا کہ اور کوئی پندِ خوشگوار؟ / اس نے کہا کہ خدمتِ پیرِ مغاں کرو
میں نے کہا کہ خیر کبھی ہے، رسمِ شر کبھی رسم / اس نے کہا کہ ترکِ رسومِ جہاں کرو
میں نے کہا کہ ہم سے زمانہ ہے سرگراں / اس نے کہا کہ اور اسے سرگراں کرو
میں نے کہا کہ رخ سے اٹھاؤ نقابِ راز / اس نے کہا کہ ہم سے نہ دل بدگماں کرو
میں نے کہا کہ زہد سراسر فریب ہے / اس نے کہا، یہ بات یہاں کم بیاں کرو
میں نے کہا غزل نے بچھایا ہے خوانِ لطف / اس نے کہا کہ دعوتِ روحانیاں کرو

میں نے کہا کہ حدِّ ادب میں نہیں ظفر
اس نے کہا، نہ بند کسی کی زباں کرو

عبدالستار صدیقی پروفیسر

۱۸۸۵ء میں سندیلہ (ضلع ہردوئی۔یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم گلبرگہ اور حیدرآباد میں ہوئی۔ ہائی اسکول کے بعد ایم۔اے،او کالج، علی گڑھ میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۸ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند لی جس سے یہ کالج اس وقت ملحق تھا۔ دو سال تک اسکول کی ملازمت کرنے کے بعد وہ دوبارہ علی گڑھ پہنچے اور یہاں ایم۔اے (عربی) کے درجے میں داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں یہاں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر جوزف ہورووِٹز (ف: فرنکفرٹ، ۵فروری ۱۹۳۱ء) عربی پڑھاتے تھے۔ صدیقی صاحب اپنی قابلیت اور عربی سے فطری مناسبت کے باعث جلد ہی استاد کے چہیتے بن گئے۔ ۱۹۱۲ء میں ایم۔اے اس امتیاز سے پاس کیا کہ انھیں یورپ میں عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حکومتِ ہند کی طرف سے وظیفہ ملا۔

۱۹۱۲ء میں جرمنی گئے۔ یہاں انھوں نے سٹراس بُرگ اور گیوٹنگن کی یونیورسٹیوں میں مشہورِ زمانہ مستشرقین نولڈیک، اشمب، لِٹ مَن اور اَندریاس کی نگرانی اور رہنمائی میں عربی کی تعلیم پائی۔ ابھی تعلیم کے تمام مراحل کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ اگست ۱۹۱۴ء کے آغاز میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی جس میں ایک فریق جرمنی تھا اور دوسرا انگلستان۔ چونکہ صدیقی صاحب برطانوی رعایا تھے، اس لیے ان کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی گئی اور ان کا جرمنی سے باہر جانا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یوں انھیں ۱۹۱۹ء تک جبراً جرمنی میں رکنا پڑا۔

ایسے حالات میں انسان بالعموم مایوسی اور کاہلی کا شکار ہو جاتا ہے، لیکن صدیقی صاحب

پر حصولِ علم کا جو نشہ چڑھ چکا تھا، اسے جنگ کی ترشی نہ اتار سکی۔ انھوں نے جرمنی میں اس جبری قیام کے زمانے میں بھی اپنی تعلیم جاری رکھی۔ پہلے ۱۹۱۶ء میں لاطینی زبان کا امتحان پاس کیا، پھر ۱۹۱۷ء میں گیوٹنگن یونیورسٹی سے خاص امتیاز سے ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا: کلاسیکی عربی میں فارسی کے دخیل الفاظ۔ انھوں نے اسے جرمن زبان میں قلمبند کیا تھا، اور یہ اسی زمانے میں جرمنی میں چھپا تھا۔

۱۹۱۹ء میں ہندستان واپس آئے اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڑھ میں عربی کے ریسرچ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ لیکن انھوں نے یہاں مشکل سے آٹھ نو مہینے کام کیا ہوگا کہ حیدر آباد سے دعوتنامہ آگیا۔ یہ وہاں پہنچے اور ستمبر ۱۹۲۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج (کلیۂ جامعۂ عثمانیہ) کے پرنسپل بنا دیے گئے، جو اس سے سال بھر پیشتر اگست ۱۹۱۹ء میں قائم ہوا تھا۔ یہاں وہ چار برس (یعنی ۱۹۲۴ء تک) رہے۔

۱۹۲۴ء میں وہ حیدر آباد سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے بلاوے پر شعبۂ عربی و علوم اسلامیہ کے صدر بن کر وہاں چلے گئے۔ وہ ڈھاکے ہی میں تھے، جب انھوں نے بمبئی یونیورسٹی کی درخواست پر زبان کے مسئلے پر پانچ ولسن خطبات دیے تھے۔

ڈھاکے میں تقریباً چار برس کے قیام کے بعد وہ ۱۹۲۸ء میں صدر شعبۂ عربی و فارسی کی حیثیت سے الٰہ آباد آئے۔ اسی زمانے میں صوبۂ متحدہ کی حکومت نے الٰہ آباد میں ہندستانی اکیڈمی قائم کی اور اکیڈمی کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی "ہندستانی" نام کا جاری ہوا۔ اپنی منصبی تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ، ڈاکٹر صدّیقی ان دونوں کے بھی روحِ رواں تھے۔ وہ مدّتوں اکیڈمی کی مجلسِ عاملہ کے بھی رکن رہے۔ ان کا آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس سے بھی بہت پرانا تعلق تھا؛ وہ دس برس تک (۱۹۲۲-۱۹۳۲ء) اس کی عاملہ کے رکن رہے۔ اور انجمنِ لسانیات کے تو وہ بانیوں میں سے تھے۔ الٰہ آباد آنے کے بعد وہ کہیں اور نہیں گئے۔ طویل اور کامیاب دورِ ملازمت

کے بعد ۱۹۴۶ء میں یہیں ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو الٰہ آباد یونیورسٹی نے انھیں اپنا پہلا ایمریٹس پروفیسر مقرر کر دیا۔ اب انھوں نے پرانے الٰہ آباد کے مضافات کی بستی راجہ پور ہی میں گنگا کے کنارے ایک وسیع اور پُر فضا مکان تعمیر کر کے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ الٰہ آباد کے بڑھنے سے راجہ پور اب شہر کا ایک محلّہ بن گیا ہے۔

ان کی طویل علمی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ نے انھیں سندِ امتیاز اور خلعت اور ڈھائی ہزار روپیہ سالانہ کا حینِ حیات وظیفہ دیا۔ یہ انھیں راشٹرپتی بھون کی ایک خصوصی تقریب منعقدہ ۲۸ اپریل ۱۹۶۲ء میں عطا کیا گیا تھا۔

کئی برس سے تندرستی بہت خراب چلی آ رہی تھی۔ آخری تین چار برس میں حافظہ بالکل جواب دے گیا تھا؛ بلکہ ہوش و حواس بھی متاثر ہو گئے تھے، جس سے یہ علم و فضل کا پتلا اور باغ و بہار شخص جسدِ بے روح ہو کر رہ گیا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اٹل انجام اب بہت دور نہیں ہے۔ اس کے باوجود جب خبر ملی کہ ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء شب کے ساڑھے نو بجے ان کا الٰہ آباد میں انتقال ہو گیا، تو دل کو دھچکا لگا۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔ جنازہ اگلے دن ۲۹ جولائی کو اٹھا؛ اور انھیں راجہ پور کے قبرستان میں جو نیوادہ گاؤں سے ملحق ہے، سپردِ خاک کیا گیا۔

اولادِ جسمانی میں دو بیٹے اپنی یادگار چھوڑے: محمد مسلم اور محمد زہیر۔ محمد مسلم صاحب یہاں ہندستان میں ہیں، الٰہ آباد میں رہتے ہیں۔ چھوٹے محمد زہیر پاکستان چلے گئے، وہاں کراچی میں قیام ہے۔

ان کی علم و ادب سے عموماً اور اردو سے محبت خصوصاً کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے بانیوں میں تو نہیں تھے، لیکن اس کے استحکام اور ترقی اور کامیابی میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ وہ اردو کے پُرجوش اور سرگرم حامی تھے۔ اور آج کل کے سہل انگار اور مغرب زدہ اصحابِ علم کے شیوۂ عام کے خلاف تقریر و تحریر میں بے ضرورت انگریزی الفاظ کے استعمال کے سخت

مخالف تھے۔
انھیں اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ پڑھنے والا ان کی تحریر کو ٹھیک پڑھے اور اسے صحیح تلفظ میں کوئی دقّت نہ ہو۔ اسی لیے وہ اپنی ہر ایک تحریر خطوں سمیت، اعراب سے مزیّن کرتے تھے۔ املا میں ان کے بعض اصول تھے جن پر وہ سختی سے کاربند رہے۔ انجمن ترقّی اردو نے ۱۹۲۱ء میں املا کے قاعدے وضع کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولوی عبدالحق (ف، اگست ۱۹۶۱ء) نے ملک کے اہلِ علم کی رائے اور مشورہ معلوم کرنے کے لیے ان کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھیجا۔ آخر میں جن اصولوں کا فیصلہ ہوا، وہ بیشتر صدّیقی صاحب کی آرا پر مشتمل تھے۔ یہ فیصلہ انجمن کے سماہی رسالے اردو میں شائع کر دیا گیا تھا۔ (اردو (۱۹۲۳ء) ۳: ۱۰ ۵۸) لوگوں نے اس سے بے اعتنائی برتی اور اس پر عمل نہیں کیا۔ لیکن اس کے بعد کم از کم انجمن کی مطبوعات اسی اصول کے مطابق چھپتی رہیں۔
ڈاکٹر صدّیقی تقریباً تمام سامی زبانوں پر حاوی تھے۔ ان کے علاوہ یورپ کی بعض زبانیں بھی جانتے تھے۔ ان کا علم وفضل اور وسیع مطالعہ ہر ایک متلاشی علم کی خدمت کے لیے ہمیشہ حاضر رہتا۔ کوئی صاحب اپنی تصنیف کے لیے کسی قسم کی معلومات طلب کرتے۔ وہ گھنٹوں اپنے کتابخانے میں مطالعہ کر کے موضوع سے متعلق مواد جمع کرتے اور اسے پوری تفصیل اور وضاحت سے قلمبند کر کے سائل کو مہیّا کر دیتے۔ کوئی دوسرے بزرگ اپنی تصنیف ہدیہ بھیج کر اس کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرنا چاہتے۔ وہ کتاب کو غور سے پڑھ کر نہ صرف موضوع ہی سے متعلق لکھتے، بلکہ املا، اعراب، کتابت اور صفحوں کے اغلاط تک کی نشاندہی کر دیتے۔ میں نے بعض اصحاب کے پاس ان کے ۲۰-۲۰ اور ۲۵-۲۵ صفحات کے، بلکہ اس سے بھی طویل تر خط دیکھے ہیں۔ کہاں ملینگے اب ایسے اصحاب، جن کا اوڑھنا بچھونا اس حد تک خالص علم ہی ہو گا! کاشکے کوئی اللہ کا بندہ ان کے خطوط جمع کر کے شائع کر دے، بے بہا معلومات کا خزانہ ہونگے یہ۔

افسوس، ان کی کوئی قابلِ ذکر مطبوعہ کتاب نہیں ملتی۔ ان کا نفاست اور تکمیل کا معیار اتنا بلند تھا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق نہ کوئی کام پورا کر سکے، نہ اس کی طباعت سے مطمئن ہوئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کے مسوّدات میں دیوانِ بیان اور نامۂ غالب کے مکمل مسوّدے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بیش قیمت مضامین کی بڑی تعداد مختلف رسائل و جرائد میں بکھری پڑی ہے۔ اگر انھیں بھی جمع کر کے ایک دو جلدوں میں شائع کر دیا جائے، تو کیا عجب کہ یہ اس دیرینہ خادمِ علم و ادب کا نام آیندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کا ذریعہ ثابت ہوں۔ رہے نام اللہ کا۔

تاج قریشی حیدر آبادی، محمّد تاج الدّین

۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ (۲۷ اپریل ۱۹۱۲ء) کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد امیرالدین قریشی پائیگاہِ آسمانجاہی کی فوج میں کپتان تھے؛ اور خود بھی چھوٹے موٹے جاگیر دار تھے۔ اس لیے تاج، گویا منہ میں چاندی کا چمچہ لیے پیدا ہوئے، جس سے ان کا بچپن اور جوانی کا زمانہ بیفکری اور بیحد آرام و آسایش میں بسر ہوا۔ اردو اور فارسی کی حدتک تعلیم بھی گھر ہی پر ہوئی۔

شعرگوئی ۱۶ برس کی عمر میں شروع کی اور اس میں سیّد علی احمد زیرک قنوجی (ف ۱۹۳۱ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ ان کے انتقال کے بعد نادر علی برتر سے سلسلۂ تلمّذ قائم کیا۔ برتر خود نواب میرزا ظہیر دہلوی (ف مارچ ۱۹۱۱ء) کے شاگرد تھے۔ اس طرح وہ ذوق کے خاندان میں شامل ہو گئے۔

ان کا ابتدائی زمانہ جس عیش و عشرت میں گذرا تھا، آخری اتنا ہی عُسرت اور کلفت میں بسر ہوا۔ منصبداری اور جاگیر ختم ہوئی، تو اسی کے ساتھ آمدنی کے تمام ذرائع بھی مسدود ہو گئے۔ اور کوئی کام کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جسم و جان کا رشتہ بحال رکھنے کے لیے رفتہ رفتہ اثاث البیت تک فروخت ہونے لگا؛ اور بالآخر انھیں اپنے وسیع جدّی مکان سے اٹھ کر ایک دوسرے محلے میں چھوٹے سے مختصر مکان میں جانا پڑا۔ ان مسلسل مشکلات کے باعث صحت مستقلاً خراب رہنے لگی۔ دوستوں اور مدّاحوں نے کچھ خبر گیری ضرور کی، لیکن پے در پے ذہنی اور جسمانی پریشانیوں نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا۔

پرانی تنفس کی شکایت نے شدت اختیار کرلی، تو آو لا گھر ہی پر علاج شروع ہوا؛ لیکن جب مسلسل کئی مہینے کی دوا دوش کے باوجود افاقے کی کوئی صورت نظر نہ آئی، تو سب طرف سے مایوس ہو کر دواخانۂ عثمانیہ (حیدر آباد) میں داخل ہو گئے۔ وہیں منگل، ۵ ستمبر ۱۹۷۲ء، دن کے ساڑھے دس بجے جان بحق ہوئے۔ تجہیز و تکفین بھی احباب نے کی۔ اسی دن نمازِ عشا کے بعد درگاہِ حضرت برہنہ شاہ کے قریبی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

افسوس، ان کا مجموعۂ کلام زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ ۵۰ برس میں جو کچھ کہا، اور یہ خاصی مقدار میں ہے، ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری مرحوم (ف ۱۹۶۲ء) نے اپنی زندگی میں ان سے خاص طور پر منظوم تاریخ دکن لکھنے کی فرمایش کی تھی۔ دراصل انھوں نے اس طرح بالواسطہ ان کی مالی امداد کرنے کا بہانہ پیدا کرنا چاہا تھا۔ لیکن تاج ان کے جیتے جی کام شروع نہ کر سکے۔ شرط یہ تھی کہ ہر مہینے کم از کم ۱۵۰ شعر ضرور کہیں گے، جن کے لیے ادارۂ ادبیاتِ اردو (حیدر آباد) کی طرف سے ان کی خدمت میں پچاس روپے پیش کیے جائیں گے۔ تاج نے کام زور کی رحلت کے بعد شروع کیا اور ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار اشعار کہے۔ یہ دراصل دو طویل نظمیں ہیں۔ عہدِ قطب شاہی سے متعلق کوئی پانسو شعر ہیں، جن کا قافیہ عیار، شعار وغیرہ ہے۔ بعد کے زمانے کے بارے میں گیارہ ہزار شعر ہوں گے؛ یہ دعا، کہا، گیا کی زمین میں ہیں۔ افسوس کہ اس کے بعد جلد ہی خود ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مالی حالت بہت کمزور ہو گئی اور اس میں تاج کو ماہانہ وظیفہ ادا کرنے کی استطاعت ہی نہ رہی۔ اس پر انھوں نے کام بند کر دیا۔ بہر حال اس نامکمل منظوم تاریخ کا مسودہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے کتابخانے میں موجود ہے۔

تاج قدیم وضع کے پختہ گو شاعر تھے۔ لیکن جدید خیالات سے کبھی بھڑکتے نہیں تھے۔ خود ان کی اپنی غزلوں میں ہمعصر سیاست کی طرف تک اشارے ملتے ہیں۔

حیدر آباد میں ان کی بدولت اردو شاعری کا جو چراغ روشن تھا، وہ ان کی وفات سے گل ہو گیا۔ چوں کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا ہے، مشکل سے چند شعر مہیا ہو سکے۔ ملاحظہ ہوں:

اٹھتی ہے دل میں ہوک سی، ہوتا ہے اختلاج سا
پچھلے دنوں نہ تھا کبھی حال خراب آج سا

کیسا کمال ان کے خدنگِ نظر میں ہے — تھا ان کے پاس ابھی، ابھی میرے جگر میں ہے
کیا جانے ان کے فضل و کرم کے مقام کو — واعظ ابھی تو مسئلۂ خیر و شر میں ہے
مضموں بلند کیوں نہ ہوں میری غزل میں آج! — شانِ کلام حضرتِ برتر نظر میں ہے
موج گرداب کے مرکز سے گریزاں ہو کر — سر کو ٹکراتی ہے ساحل سے پریشاں ہو کر

بلا اشتاق فطرت کھیلتی رہتی ہے طوفاں سے
مصائب دوست نظریں رُخ نہیں کرتی ہیں ساحل کا

علو ظرفی سلامت، بات رکھ لی میں نے ساقی کی
اٹھایا جام یوں ہنس کر کہ سب لبریز ہی سمجھے

شیخ کے دل میں، نہ اخلاص، نہ الفت، نہ گداز
صرف احرام ہی احرام ہے، کیا عرض کریں

قدِ غیرت شمشاد ہے، لب غنچہ، دہن پھول — سر تا بقدم ہیں وہ بہار اور ہمہ تن پھول
کلیاں کا ہے شکوہ، نہ عنادل کی شکایت — ہیں عاملِ پابندیِ آئینِ چمن پھول
نکہت کبھی پابندِ گلستاں نہیں ہوتی — گو پاسِ وفا سے ہیں محصورِ چمن پھول
پروردۂ آغوشِ بہاراں ہیں یہ دونوں — ہیں فخرِ چمن خار، تو ہیں نازِ چمن پھول

نہیں کٹتی ہیں کاٹے سے غم و آلام کی گھڑیاں
یہ دیکھا ہے کہ پَر لگتے ہیں عشرت کے زمانے کو

چمن میں، میں بھی رہتا تھا، چمن میں وہ بھی رہتے تھے
گلستاں کو میں روتا ہوں، عنادل آشیانے کو

چمن کا جسم وہی داغدار و خاک آلود زرا اتار کے تو دیکھیے لباسِ بہار
گلوں نے چھیڑ دیا جب خزاں کا افسانہ ہوا کی طرح سے اڑنے لگے حواسِ بہار
یونہی رہا جو چمن میں فلک خلل انداز بہار پر نہ کریگا کوئی قیاسِ بہار
فریب خوردۂ رنگِ چمن سمجھتے ہیں چٹکنا غنچوں کا گویا، ہے التماسِ بہار
ہے کس لیے غمِ تخریبِ گلستاں بلبل! کہ اختتامِ خزاں ہی پہ ہے اساسِ بہار
ملیگا کیا اسے نظارۂ چمن کا مزا نگاہ جس کی نہیں ہے اداشناسِ بہار
فضا حسیں ہے، میں حاضر ہوں، آپ بھی آئیں ہے ایک جانِ چمن سے، یہ التماسِ بہار
نظر میں آگئی رنگینیِ چمن کھنچ کر اسی کو کہتے ہیں اے تاج! اقتباسِ بہار

ہر شام نیا روپ ہے، ہر صبح نیا رنگ بیشک ہیں عجب خالقِ ماحولِ چمن پھول
جو سینہ سپر ہوتے ہیں یورش پہ خزاں کی چمکاتے ہیں بیشک، وہی تقدیرِ چمن پھول
ہر ایک سے یہ بار اٹھایا نہیں جاتا کیا طوق کوئی ہار ہے، کیا دار و رسن، پھول؟
رہتے ہیں خوشی میں بھی جو یہ چاک گریباں سچ جانیے، ہیں واقفِ انجامِ چمن پھول
بن جاتے ہیں وہ، زخم بہاروں کے دلوں کا کھلتے ہی جو ہو جاتے ہیں محرومِ چمن پھول

ہے اس کے سینے میں کتنوں کی آبرو پنہاں ہے پردہ دار عجب میکدہ کا دروازہ
حرم میں، دیر میں، ہر ایک جا نہیں سکتا کسی پہ بند نہیں میکدہ کا دروازہ

تحملِ شامِ غم کے قرباں، تیقنِ روشنی سلامت!
افق سے اب پھوٹتی ہیں کرنیں، رہیگی کیا تیرگی سلامت

رکھے آباد خدا، میری تمناؤں کو ایک دنیا ہے اسی دل کی بدولت دل میں
کس ستم کیش کو، اے تاج! دیا دل تم نے آنکھ میں جس کی مروت، نہ محبت دل میں

برسوں دیا ہے آبلۂ پا کا خوں اسے پہچانتی ہے خوب، تری رہگذر مجھے
دن میں بھی پھر وہی ہے اندھیروں سے سابقہ تھی کس قدر امیدِ نمودِ سحر مجھے!

فغانِ گرم، لبِ خشک، آہِ سرد نہیں تو یہ سمجھتی ہے دنیا کہ دل میں درد نہیں
وہی تو پھول گلستاں کی لاج رکھتے ہیں خزاں کی رت میں بھی رخسار جن کے زرد نہیں

رہِ وفا میں، ہے ہلچل کا اس قدر افلاس ۔۔۔ کہاں کے نقشِ قدم، قافلے کی گرد نہیں

آج بھی اس کے سمجھنے کو، ہیں حیراں کتنے ۔۔۔ آدمی کتنے ہیں، اس دور میں انساں کتنے!

پھول ہیں عشرتِ یک لمحہ پہ شاداں کتنے ۔۔۔ یہ ہیں ناواقفِ انجامِ گلستاں کتنے!

سوزِ دل، سازِ الم، نغمۂ جاں، کیفِ حیات ۔۔۔ ایک افسانۂ الفت کے، ہیں عنواں کتنے!

یاد کر کر کے تجھے آخرِ شب ڈوب گئے ۔۔۔ جھلملاتے ہوئے تارے سرِ مژگاں کتنے!

کبھی حقیقتِ جلوہ کی اک جھلک نہ ملی ۔۔۔ بہ زعمِ دانش و عرفاں بہت دماغ چلے

ایاغ بھر کے کرو عافیت طلب، رندو! ۔۔۔ دعا قبول ہوا کرتی ہے چراغ جلے

کچھ اس ادا سے ہوئے جلوہ گر وہ محفل میں ۔۔۔ کئی چراغ بجھے، اور کئی چراغ جلے

حدیثِ ناز چھڑے، ذکرِ ناپسند چلے ۔۔۔ بصد خلوص، بہ اندازِ دلپسند چلے

دیارِ عشق میں، یوں ان کے غم پسند چلے ۔۔۔ سپاہ جیسے کہیں ہو کے فتحمند چلے

رہِ حیات میں اکثر نشیب آئے، مگر ۔۔۔ بلند حوصلہ، ہر وقت سر بلند چلے

کوئی جنونِ محبت کی راہ کیا روکے! ۔۔۔ کچھ اس کے آگے نہ آئینِ قید و بند چلے

ہے یہ تغیرِ فطرت کبھی ایک لمحۂ فکر ۔۔۔ کہ شر کی سمت یہ کیوں عافیت پسند چلے!

حریمِ ناز میں بھی نقشِ پا چمک اٹھے ۔۔۔ کچھ ایسی شان سے تیرے نیاز مند چلے

وہی جہانِ وفا کے ہیں شہریار اے تاج!
جو دردمند رہے، اور دردمند چلے

مختار صدیقی، مختار الدین

ان کا خاندان سیالکوٹ (پاکستان) کا رہنے والا تھا، جہاں وہ یکم مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ لیکن ان کی صغرسنی ہی میں ان کے والد نقلِ مکان کر کے گوجرانوالہ چلے آئے تھے۔ اسی لیے مختار الدین صاحب کی تعلیم گوجرانوالہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے بی، اے کا امتحان اسلامیہ کالج، لاہور سے پاس کیا۔

ملازمت کا پورا زمانہ ریڈیو کی ملازمت میں گزرا۔ اولاً آل انڈیا ریڈیو میں اسسٹنٹ کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ تقسیمِ ملک کے بعد اسی عہدے پر ریڈیو پاکستان چلے گئے۔ جب وہاں ٹیلی ویژن کا شعبہ قائم ہوا، تو اس میں مضمون نویسی کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اسی عہدے پر اپنی موت تک کام کرتے رہے۔

قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا جس پر انھیں فوجی اسپتال، لاہور میں پہنچا دیا گیا۔ آٹھ دن وہاں رہے اور کچھ افاقے کے آثار نظر آنے لگے تھے کہ ۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء کو یکایک پھر شدید حملہ ہوا۔ اسی دن ساڑھے آٹھ بجے شام انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن (۱۹ ستمبر) اٹھا اور انھیں قبرستان اچھرہ (لاہور) میں سپردِ خاک کیا گیا۔

سات کے تعمیے سے تاریخ ہوئی:

ازسرِ زخمِ دلم تاریخِ وصلش شد رقم چوں من شنیدم: "راہیِ ملکِ عدم مختار شد"

۷

(۱۹۷۲=۱۹۶۵+۷)

اپنے پیچھے جسمانی یادگار دو لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔

انھوں نے علم و ادب کی بڑی قابلِ قدر خدمت کی ہے۔ ابتدا میں انھوں نے

سیماب اکبرآبادی سے اصلاح لی تھی۔ وہ بیک وقت شاعر اور ادیب اور نقّاد تھے۔ انھوں نے بھی میراجی کے ساتھ حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور میں نئے نئے تجربے کیے، جو اگرچہ نہ سب کامیاب ہوئے، نہ انھیں پسندِ عام کی سند ملی؛ لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ انھیں تجربوں کی بدولت اردو شاعری میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔

ان پر تصوّف اور خاص کر حضرت سلطان باہو کا بہت اثر تھا۔ کلاسیکی موسیقی میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ چنانچہ ان کی شاعری میں اس کے آثار بہت نمایاں ہیں۔ ان کا مختصر مجموعۂ کلام "منزلِ شب" (لاہور ۱۹۵۵ء) ان کے آہنگ کا نمایندہ ہے۔ اس میں بیشتر نظمیں نغمگی کی فضا اور تاثر کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے چینی الاصل امریکی مصنّف لِن یُوتانگ کی مشہور کتاب کا ترجمہ بھی "جینے کی اہمیت"، کے عنوان سے کیا تھا۔ ممکن ہے، کچھ اور تصنیفات بھی چھپی ہوں، جو میری نظر سے نہیں گزری ہیں۔ انھیں اپنی لیاقت اور صلاحیت کا شدید احساس تھا، اور اس بات کا افسوس کہ زمانے نے ان کی کماحقہٗ قدر نہیں کی۔ روایت ہے کہ موت سے چند دن قبل ایک دوست مزاج پُرسی کو گئے، تو ان کے حال پوچھنے پر میرؔ کا یہ شعر پڑھا:

ایک محروم پھرے، میرؔ ہمیں دنیا سے ‎ ‎ ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

یہ چند شعر ان کے مجموعے "منزلِ شب" سے لیے گئے ہیں:

دیکھیں، بیتاب رہینگے کب تک...! ‎ ‎ چین دل کو کسی عنواں نہ سہی
وحشت آثار، در و بام ہیں کیوں! ‎ ‎ یہ مرا گھر ہے، بیاباں نہ سہی

موت کو زیست ترستی ہے یہاں ‎ ‎ موت ہی کونسی سستی ہے یہاں
سب خرابے ہیں تمناؤں کے ‎ ‎ کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں

ہم ہی تو تھے عینِ ذات، لیکن ‎ ‎ ہونا، ہوا سنگِ راہ اپنا

غم کی اس بیزار یکسانی کا کچھ تو ہو علاج ‎ ‎ ہم نہیں کہتے کہ ان سے ہی ملاقاتیں کرو

آٹھ پہر آشفتہ خیالی، کس کو بھلا خوش آتی ہے!
جی مانے، تو ہم بھی کچھ دلجمعی کا سامان کریں
جب سے قفس کا گوشہ چھوٹا، ایک ہی دُگدا رہتی ہے
جینا مشکل، مرنا مشکل، کیا مشکل آسان کریں

میل ملاپ کی باتوں میں، اب سوچتے ہیں دلچسپی لیں
شاید یہ معلوم ہو کیونکر ہم کو خوئے فراق ہوئی

دل ہی کے دَم تک مَر مَر کر جینے کے سارے جھگڑے تھے
سارے قصّہ پاک ہوا ہے، جھوٹے سچے سہاروں کا

تیری لگن کے لاگ، کے ہاتھوں ہم بیچین کمال ہوئے
جتنے ارماں جی میں رہے، وہ اپنے جی کا وبال ہوئے
آج کی بات نہیں، ان حالوں ہم کو برسوں گزرے ہیں
جوں توں رات گزاری لیکن دن کو سوا بیحال ہوئے
شاہِ خدا ہے، آج زمانہ آیا ہم بے ہنروں کا
ورنہ اس اک بستی میں بھی کیا کیا اہلِ کمال ہوئے!

گلیاں وہ سنسان ہیں، جن میں تیرا دِوانہ پھرتا ہے
اس کے بہانے، دید کو تیری، سارا زمانہ پھرتا ہے
ملکوں ملکوں، شہروں شہروں، اپنے غم کی شہرت تھی
یوں در پردہ محفل محفل، تیرا فسانہ پھرتا ہے

ساحل پر کیا پہنچے ہم، طومار سنے ترکیبوں کے
پہلے یہ شکستہ کشتی تھی، اور طوفانوں کے ریلے تھے

دل زدگاں کے دور سے پہلے، دنیا رستی بستی تھی
پھر کچھ چرچے ایسے پھیلے، چین کسے، آرام کہاں!

تھی تو سہی، پر آج سے پہلے ایسی حقیر فقیر نہ تھی
دل کی شرافت، ذہن کی جودت، اتنی بڑی تقصیر نہ تھی
سچ کہتے ہو، ہم ایسے کہاں اور سوز و گدازِ شوق کہاں!
سچ ہے، مرے آیینۂ دل میں کوئی کبھی تصویر نہ تھی
یہ تسلیم رہے گا ہے کچھ دلچسپی رہتی ہے
ورنہ تیری دنیا میں کبھی، کوئی ہمیں آرام نہیں
سچ کہتے ہیں منزل والے، ہم میں گدازِ شوق نہ تھا
سچ ہے، انھیں کے اشک تھے موتی ان کی آہیں آہیں تھیں
اب کچھ بھی نہیں ہیں یعنی آ کر درویشوں میں بیٹھے ہیں۔
دن وہ تھے جب اپنے بھی سر پر ٹیڑھی ترچھی کلاہیں تھیں
نکتہ وروں نے ہم کو سجھایا، خاص بنو اور عام رہو
محفل محفل صحبت رکھو، دنیا میں گمنام رہو
یہ بھی کرامت ہوگی شاید اس افتادِ طبیعت کی
ورنہ دل سے کس نے کہا تھا، یوں مغموم مدام رہو

پنہاں بریلوی، سپہر آرا خاتون عرف رابعہ

بریلی کے ایک سربرآوردہ علمی خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کے والد مولوی عبدالاحد صاحب کا شہر کے معزز لوگوں میں شمار تھا، ان کی سکونت گھیر عبدالقیوم خان محلہ شاہ آباد (بریلی) میں تھی۔ مولوی عبدالاحد مرحوم ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم الہ آباد کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔ ان کی چار صاحبزادیاں تھیں، اور حسنِ اتفاق سے چاروں شاعرہ: بڑی آمنہ خاتون نخفت؛ منجھلی سپہر آرا خاتون عرف رابعہ پنہاں؛ سنجھلی بلقیس جمال، جمال وجمالہ؛ سب سے چھوٹی حسن آرا بیگم عرف میمونہ کا تخلص غزالہ تھا۔

سپہر آرا رابعہ پنہاں ۷ اگست ۱۹۰۶ء کو سہارنپور میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیم سراسر گھر پر اور وہ بھی بیشتر اپنے والد سے ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اردو اور فارسی کے بعد انگریزی بھی پڑھی۔ چونکہ گھر کا ماحول علمی تھا، اس لیے ان کا اس سے متاثر ہونا لابد تھا۔ ابھی کم عمر تھیں کہ اردو میں مضمون لکھنے لگیں۔ سولہ برس کی تھیں کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو پہلے کوئی سال بھر کے لیے، ماجد علی صاحب سے اور بعد کو طالب علی طالب الہ آبادی (ایم۔ اے۔ ایل ایل بی، ایڈوکیٹ، الہ آباد) سے مشورہ رہا۔ جلد ہی طالب صاحب نے نظم و نثر میں فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔

۱۹۲۵ء میں مولوی عبدالاحد کا انتقال ہوگیا، جس کے بعد خاندان کو الہ آباد کی سکونت ترک کر کے واپس آبائی وطن بریلی آنا پڑا۔ تین سال بعد ۱۹۲۸ء میں اپنے ایک قریبی عزیز صوفی صغیر حسن صاحب، (پرنسپل اسلامیہ کالج، الہ آباد)

سے عقدِ نکاح ہوگیا۔ خوش قسمتی سے وہ بھی علمی مذاق کے تھے، اس لیے ہر طرح سے ان کے ذوق کی تکمیل و ترقی میں معاون ثابت ہوئے۔
تقسیمِ ملک کے بعد خاندان سمیت پاکستان چلی گئیں اور کراچی میں سکونت اختیار کرلی۔ وہیں پیر کے دن ۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو انتقال ہوا۔
پنہاں کو اپنے والد (مولوی عبد الاحد) سے شدید محبت تھی۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے رحلت کی، تو اس سانحے کا انھیں بہت صدمہ ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے بہت نظمیں لکھی تھیں، جن کا مجموعہ 'اشکِ خونیں' کے عنوان سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ اس صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے میں یعنی تقسیمِ ملک سے قبل تک ان کا کلام ملک کے بیشتر رسائل و جرائد میں کثرت سے چھپتا رہا ہے۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی خوب کہتی تھیں، نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ غزل اور نظم اور افسانہ ان کے خاص میدان تھے۔ غرض خوش فکر اور خوش گو شاعرہ تھیں۔ کلام میں پختگی اور جذبات کی عکاسی ہے۔ افسوس کہ کلام کا کوئی مطبوعہ مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔
تلاش سے جو چند شعر دستیاب ہوئے، نذرِ ناظرین ہیں:

میں اک طرف ہوں شکلِ خزاں پائمالِ یاس — اک سمت وہ بہار کا جلوا لیے ہوئے
عشقِ جنوں نواز چلا بزمِ ناز سے — اک اضطراب و شوق کی دنیا لیے ہوئے
میری تو ہر نگاہ ہے وقفِ عبودیت — وہ ہر ادا میں حسنِ کلیسا لیے ہوئے
مرہم سے بے نیاز ہیں، پنہاں! یہ زخمِ دل — کیا کیا فسوں ہے چشمِ دل آرا لیے ہوئے

دیدنی ہے ترے عتاب کا رنگ — شیشۂ چشم میں شراب کا رنگ

شیشۂ مینا میں پنہاں برق ہے — حسنِ پُرفن آج زیرِ دام ہے

جبینِ حسن پر سرخی سی دوڑی — نگاہِ آرزو نے کر دیا کیا
یہ ہونا بھی بقدرِ یک نفس ہے — ہماری ابتدا کیا، انتہا کیا
جفا و ناز کی خوگر ہوں، پنہاں! — خدا معلوم، ہے رسمِ وفا کیا

حضرت امیر خسرو کی زمین میں فارسی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

جمالش زینتِ دل بود، شب جائے کہ من بودم
بچشمم دہر باطل بود، شب جائے کہ من بودم

نگاہم بر تجلائے رُخِ آیینہ رخسارے
سرم بر پائے قاتل بود، شب جائے کہ من بودم

بپُرس از رہروِ کامل طریقِ عشق و الفت را
سرِ تلوار منزل بود، شب جائے کہ من بودم

چساں دل محو میسازد زیادم، کیفِ دوشینہ
دلم نخچیرِ قاتل بود، شب جائے کہ من بودم

خطِ رنگیں کہ بر پیشانیِ بسمل کشیدہ تیغ
نشانِ عشقِ کامل بود، شب جائے کہ من بودم

خمِ زلفِ نگارے کرد پنہاں! طرفہ اعجازے
خیالم در سلاسل بود، شب جائے کہ من بودم

محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ

ان کا خاندان اصل میں دلّی وال تھا جہاں ان کے والد تجارت کرتے تھے۔ محمد اسماعیل مہرولی (دلّی) کے نواحی گاؤں پالی میں ۴ اپریل ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم سراسر دلّی میں ہوئی تھی۔ بالآخر ۱۹۰۸ء میں پانی پت منتقل ہو گئے۔

ان کی مکتبی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن وہ صحیح معنوں میں طالبعلم تھے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق انھیں بچپن سے تھا۔ جو کمی درسی اور امتحانی تعلیم سے رہ گئی تھی، اسے انھوں نے ذاتی مطالعے سے پورا کیا۔ اور اپنی محنت اور سلیقے سے علمی اور ادبی دنیا میں وہ مقام حاصل کیا کہ ان کا ہمارے صفِ اوّل کے مصنّفوں میں شمار ہوتا تھا۔

انھوں نے ملازمت کا آغاز حالی مسلم ہائی اسکول، پانی پت سے کیا جہاں وہ اردو اور فارسی پڑھاتے تھے لیکن بجانے کیوں، اس ماحول میں ان کا دل نہیں لگا جلد ہی وہاں استعفیٰ داخل کر کے مقامی وکٹوریہ میموریل لائبریری میں کتابدار مقرر ہو گئے۔ یہاں سے الگ ہوئے، تو مولانا حالی مرحوم (ف دسمبر ۱۹۱۴ء) کے کتابخانے کے نگراں بن گئے۔ یہاں وہ پندرہ برس تک رہے۔

قدرت نے انھیں صحافی اور مصنّف بننے کی صلاحیت بدرجۂ اتم ودیعت کی تھی۔ مضمون تو وہ بہت تھوڑی عمر ہی میں لکھنے لگے تھے؛ ان کا سب سے پہلا مضمون پندرہ برس کی عمر میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے اپنا

ذاتی ماہنامہ "جامِ جہاں نما" کے نام سے پانی پت سے جاری کیا تھا؛ بعد کو مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی کے مشورے پر انھوں نے اس کا نام بدل کر "کائنات" کر دیا۔ اس کے علاوہ حالی مسلم ہائی اسکول، پانی پت کے ماہنامے "مشعل" کی ادارت بھی ان کے سپرد رہی۔

انھوں نے یہ سب پرچے اس کامیابی سے چلائے کہ چند سال بعد جب ۱۹۳۲ء میں حکومتِ پنجاب نے دیہات سدھار کے محکمے کی سرپرستی میں جھنگ (حال پاکستان) سے ایک ہفتہ وار پرچہ "عروج" جاری کرنے کا فیصلہ کیا، تو اس کی ادارت کے لیے تقریباً ستّر امیدواروں میں سے شیخ محمد اسماعیل کا انتخاب ہوا۔ شیخ صاحب نے ادارت قبول کرلی، لیکن شرط یہ رکھی کہ میں اس پرچے میں حکومت کی خوشامد نہیں کرونگا۔

یہ پرچہ بہت کامیاب رہا۔ چھ مہینے بعد لفٹنٹ گورنر ایمرسن کے دفتر سے خط ملا کہ لاٹ صاحب تمھارے کام سے بہت خوش اور مطمئن ہیں؛ تم لاہور آکر سندِ خوشنودی لے جاؤ۔ شیخ صاحب نے لاہور جانے اور انگریز سے سند قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

انگریز کے بارے میں یہ جذبۂ مخالفت انھیں اپنے دادا حاجی محمد ابراہیم مرحوم سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ اچھے شاعر، اچھے ناثر اور صوفی مزاج بزرگ تھے۔ ان کی پوری زندگی انگریزی راج کی مخالفت میں گزری۔ یہی شیخ محمد اسماعیل کا بھی مزاج تھا، اگرچہ اس کا مظاہرہ عملی سیاست میں نہیں ہوا۔

انھوں نے سب سے پہلے ایک مختصر سا رسالہ "لوریاں اور پہیلیاں" کے نام سے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی فرمایش پر لکھا۔ یہ اسی زمانے میں چھپ گیا تھا اور اب بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔

وہ حالی اور سر سیّد کے حالات کے گویا حافظ تھے۔ انھوں نے مولوی عبدالحق مرحوم کے کہنے پر برسوں کی محنت کے بعد حالی کے مضامین جمع کیے؛ اور مسودہ مولوی صاحب موصوف کے حوالے کر دیا۔ لیکن جب کتاب چھپی، تو انھوں نے اس پر

شیخ صاحب کا نام نہیں چھاپا، بلکہ دیباچے میں لکھا کہ یہ مضمون کچھ میرے اور کچھ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے جمع کیے ہوئے ہیں، حال آں کہ بقول شیخ صاحب اس میں ان کی طرف سے ایک سطر کا بھی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

۱۹۳۵ء میں پانی پت میں حالی صد سالہ یادگار منائی گئی تھی۔ اس کے محرک بھی دراصل شیخ محمد اسماعیل ہی تھے۔ اس تقریب کی صدارت مرحوم نواب حمید اللہ خاں والیِ بھوپال (ف فروری ۱۹۶۰ء) نے کی تھی۔ ان کے علاوہ علاّمہ اقبال (ف اپریل ۱۹۳۸ء) نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ شیخ صاحب نے اس تقریب کی مکمل رُوداد ماہنامہ "حیاتِ نو" (پانی پت) میں شائع کی تھی۔ ان کی تصنیف "تذکرۂ حالی" بھی اسی تقریب کی یادگار ہے۔

تقسیمِ ملک کے بعد وہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں تباہ حال لاہور پہنچے۔ یہاں انھوں نے بسر اوقات کے لیے اپنے قلم کا سہارا لیا اور ماہنامۂ "عالمگیر" کے مدیر مقرر ہو گئے؛ دو سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ لیکن چند ہی مہینے بعد رسالے کے مالک حافظ محمد عالم (ف ۱۶ جنوری ۱۹۵۱ء) سے اختلاف ہو گیا اور انھیں مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد کہیں کوئی ملازمت نہیں کی۔

انھوں نے کم و بیش سو کتابیں تالیف و ترجمہ کی ہوں گی۔ ان میں بعض بڑے معرکے کی چیزیں ہیں۔ مثلاً انھوں نے سابق صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خاں کی فرمایش پر مقالاتِ سرسیّد (۱۶ جلد) جمع کیے۔ ان کے علاوہ مکتوباتِ سرسیّد، مکاتیبِ حالی، افکارِ سلیم وغیرہ ایسی کتابیں ہیں، جن کے بغیر تاریخِ ادبِ اردو مکمّل ہی نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے حالی کی سوانح عمری کے لیے وافر مواد جمع کیا تھا۔ تاریخِ اسلام کی بھی کئی جلدیں قلمبند کی تھیں۔ مرحوم عقیدے کے لحاظ سے احمدی تھے۔ انھوں نے کچھ کتابیں اس تعلق سے خود بھی تصنیف کی تھیں اور بعض دوسرے حضرات کی بھی شائع کی تھیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی جو کتابیں مسوّدوں کی شکل میں رہ گئی ہیں، ان کی بھی خاصی تعداد ہے۔ خدا نہ کرے، وہ

ضائع ہوجائیں!

حکومتِ پاکستان نے ان مسلسل علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں دس ہزار روپیہ نقد انعام اور تمغۂ حسنِ کارکردگی عطا کیا تھا (۱۹۷۱ء)۔ اس کے علاوہ کئی برس سے انھیں ۲۵۰ روپے ماہانہ وظیفہ بھی مل رہا تھا۔ غرض مالی پہلو سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ لیکن فلک یہ تھوڑی سی عافیت بھی نہ دیکھ سکا۔

عمر کے ساتھ مختلف عوارض تو لازمۂ بشریت خیال کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن جنوری ۱۹۶۲ء میں ان کے بڑے بیٹے شیخ محمد احمد کی عین شباب میں بمرضِ تنفّس ناگہانی موت نے ان کی کمر توڑ دی۔ پھر سال بھر بعد بیوی داغِ مفارقت دے گئیں۔ ان سانحات نے ان کا صبر و سکون تباہ کر کے رکھ دیا۔

آخر عمر میں بہت لاغر ہو گئے تھے۔ حافظہ بھی کمزور ہو چکا تھا۔ اگست ۱۹۷۲ء میں ایک دن بازار میں جا رہے تھے کہ ایک سائیکل سے ٹکرا کر گر گئے۔ اس سے بہت زخم آئے؛ کولھے کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ جب کسی گھریلو علاج سے فائدہ نہ ہوا، تو میو اسپتال، لاہور میں داخل ہو گئے۔ عملِ جرّاحی کامیاب رہا، اور کچھ افاقے کے آثار نظر آنے لگے تھے کہ یکایک فشارِ دم نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ وہیں جمعرات ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء (۳ رمضان ۱۳۹۲ھ) سوا پانچ بجے شام راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

سوگواروں میں اپنے پیچھے ایک بیٹا شیخ مبارک محمود اور پوتا احمد طاہر (خلف شیخ محمد احمد مرحوم) چھوڑے۔

سیّد سخی حسن نقوی امروہوی

امروہہ (ضلع مراد آباد) کے نقوی سادات کے مورثِ اعلیٰ مخدوم سیّد شرف الدین شاہ ولایت (ف رجب ۷۸۳ھ/اکتوبر ۱۳۸۱ء) کے والد میران سیّد علی بزرگ (پسر سیّد مرتضیٰ) دوسری مرتبہ، بعہدِ فیروز شاہ تغلق (اور ایک اور روایت کے مطابق غیاث الدین بلبن کے زمانے میں) عراق کے شہر واسط سے ہندستان آئے اور امروہہ میں بس گئے۔

امروہہ کی سب سے پہلی تاریخ ۱۸۸۹ء میں مطبع گلزارِ ابراہیم، مراد آباد سے بعنوانِ "تاریخِ اصغری" شائع ہوئی تھی، جس کے مصنّف سیّد اصغر حسین تھے؛ یہی سیّد سخی حسن کے پردادا تھے۔ افسوس کہ اس مفید کتاب کا نسخہ اب بہت کمیاب ہو گیا ہے۔

سیّد سخی حسن کے والد عسکری حسن (عرف میر کلّو) زمینداری پیشہ تھے۔ ان کا ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا؛ امام باڑہ علمدار علی خان (محلّہ گذری)، امروہہ میں دفن ہیں۔

سیّد سخی حسن یکم نومبر ۱۹۱۴ء کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں امام المدارس ہائی اسکول، امروہہ سے دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد گھر کی مالی حالت مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سازگار نہیں رہی تھی۔ لہٰذا انھوں نے بچی کھچی جاداد بیچ ڈالی؛ تاکہ اس سے تعلیم جاری رکھنے کی سبیل نکل آئے؛ لیکن افسوس کہ یہ بھی نہ ہو سکا۔ اس پر انھوں نے بمبئی آرٹ اسکول کی سند کا امتحان دیا اور اس میں کامیابی کے بعد اپنے اسکول ہی میں آرٹ ٹیچر مقرر ہو گئے۔ جب دو سال بعد حالات کچھ بہتر ہو گئے، تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

یہاں سے یکے بعد دیگرے بی اے (۱۹۳۸ء) اور بی ایڈ (۱۹۳۹ء) کی اسناد حاصل کیں۔ امروہہ واپس آئے، تو میونسپل بورڈ میں تعلیمی سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ ملا۔ اسی دوران میں انھوں نے نجی مطالعے سے آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند لی (۱۹۵۷ء)۔ تین برس بعد (۱۹۶۰ء) میونسپل بورڈ سے رخصت لی اور اسمٰعیل بیگ محمد ہائی اسکول بمبئی کے پرنسپل کی حیثیت سے وہاں چلے گئے۔ لیکن بمبئی کی مرطوب آب وہوا راس نہ آئی اور بیمار رہنے لگے۔ بادلِ ناخواستہ ملازمت ترک کر کے وطن واپس آئے اور دوبارہ اپنی جگہ سنبھال لی۔ ۱۹۶۷ء میں جب امام المدارس ہائی اسکول ترقی کر کے انٹر کالج بن گیا، تو یہ اس کے پرنسپل مقرر ہوگئے؛ اپنی وفات کے وقت اسی عہدے پر قائم تھے۔

ان پر قلب کا پہلا دورہ اپریل ۱۹۷۱ء میں پڑا تھا، جب وہ الٰہ آباد میں کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ دوسرا موت کے چار دن قبل پڑا۔ اس سے کچھ افاقہ محسوس کر رہے تھے کہ اچانک تیسرا شدید ترین حملہ جمعہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء شب میں نو بجے ہوا۔ نصف گھنٹے بعد جان بحق ہو گئے۔ جنازہ اگلے دن (ہفتہ ۲۱ اکتوبر) اٹھا؛ امام باڑہ علمدار علی خاں میں اپنے والد کے جوار میں سپردِ خاک ہوئے۔

پڑھنے لکھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے سے تھا؛ اس میں خداداد ذہانت اور ذاتی وجدان ان کے رہنما ثابت ہوئے۔ لکھنے کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ٹیگور کی بعض تحریروں کے ترجمے سے ہوا، جو مختلف مقامی مجلّوں میں شائع ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ریڈیو سے تعلق پیدا ہوا، تو بچوں اور خواتین کے پروگراموں کے لیے بہت کچھ لکھا۔ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر سیّد عابد حسین نے ایک رسالہ 'نئی روشنی' کے نام سے جاری کیا تھا۔ سیّد سخی حسن اس کے لیے لکھنے لگے۔ بعد کو جب خود اعتمادی پیدا ہوئی اور احباب کا حلقہ بھی وسیع ہوا، تو ان کے مضامین اور افسانے دوسرے رسائل و جرائد میں بھی چھپنے لگے۔ ان کے ۱۴ طبع زاد اور مختار مضامین اور افسانوں کا مجموعہ "نمک پارے" کے عنوان سے دلّی سے ۱۹۵۲ء

میں شائع ہوا تھا؛ اس کے شروع میں ڈاکٹر سید عابد حسین کے قلم سے چند سطریں "تقریب" کے عنوان سے ہیں۔ ان کی کتاب "ہمارا قدیم سماج" ان کی موت سے تھوڑے دن پہلے شائع ہوئی تھی۔ ترقی اردو بورڈ ہی کی فرمائش پر انھوں نے پروفیسر ترپاٹھی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ "قدیم ہندستان کی تاریخ" کے نام سے کیا تھا، جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ ان کے مضامین کی خاصی بڑی تعداد مختلف رسائل میں منتشر پڑی ہیں۔

مخفی، صالحہ بیگم

۱۹۲۴ء میں کلکتے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے خاندان کا مسقط الرأس پٹنہ تھا۔ جہاں سے ان کے دادا بہار اور بنگال کے اضلاع میں ملازمت کے بعد کلکتہ پہنچے اور وہیں بس گئے۔ مخفی کے والد سیّد وحیدالدین احمد نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور بعد کو کلکتے میں سرکاری ملازم ہو گئے۔ خاندان کا ماحول انگریزی کی تعلیم کے باوجود مذہب اور تصوف کی روایت میں رچا ہوا تھا۔ چنانچہ سیّد وحیدالدین احمد بھی دفتر سے آتے، تو درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے، اور ان کے ارد گرد اصحابِ علم و فضل کا مجمع رہتا۔

خان بہادر نواب محمد تقی پٹنہ کے رئیس اور با اثر اشخاص میں سے تھے، لیکن ان کی ناوقت موت نے گھر کی مالی حالت بہت کمزور کر دی۔ لہٰذا ان کی بیگم نے پٹنے کی جاوداد بیچ ڈالی اور جو کچھ ملا، اسے اور اپنی دونوں کمسن بچیوں کو لے کر کلکتہ چلی آئیں۔ یہیں چھوٹی کا عقدِ نکاح سیّد وحیدالدین احمد سے ہوا۔ بدقسمتی سے وحیدالدین احمد بھی جوانا مرگی کا شکار ہو گئے۔ اس وقت صالحہ بیگم بہت کم عمر تھیں۔

صالحہ بیگم کو کسی اسکول میں باضابطہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جو کچھ حاصل کیا، گھر پر اپنی ذاتی محنت اور لیاقت سے۔ بدقسمتی سے خانگی زندگی بہت المناک رہی۔ پہلی شادی سورت کے ایک صاحب عبّاس بھائی سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک لڑکی (طاہرہ کلثوم) ہے۔ ان سے علاحدگی کے بعد تعلیمی اور سماجی کاموں میں دلچسپی لینے لگیں۔ چھوٹی بچیوں کے لیے مدرسۃ البنات الغربا (تانتی بگان) اور بڑی لڑکیوں کے لیے ہوڑہ میں ایک یتیم خانہ قائم کیا۔ انھوں نے دونوں ادارے

بحسن وخوبی کامیابی سے چلائے۔ لیکن ذمہ داری بڑھ جانے اور مالی مشکلات کے باعث بعد کو انھیں دوسروں کے حوالے کر دیا۔ یہ پشتم پشتم آج تک چل رہے ہیں۔
اسی زمانے میں ان کا نکاح ثانی عبدالحی صاحب سے ہوا، جو مقامی پریزیڈنسی کالج میں انگریزی کے مدرّس تھے۔ بدقسمتی سے وہ ۱۹۴۷ء میں جالندھر میں ایک فرقہ وارانہ فساد کا شکار ہو گئے۔ ان سے دو بیٹیاں (رضیہ بانو اور فاطمہ فرخ) یادگار ہیں۔
اگرچہ تنفس کا عارضہ پرانا تھا، لیکن موت ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو اچانک فشارِ دم سے ہوئی۔
انھوں نے شاعری ۱۹۳۴ء میں شروع کی اور اس میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ انھوں نے کسی زمانے میں ہفتہ وار "عبرت" بھی کلکتے سے جاری کیا تھا، جو بہت دن تک ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۷ء میں ان کے سلاموں کا مجموعہ 'جذباتِ مخفی' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ 'نیا شاہکار' کے نام سے کچھ افسانے شائع ہو چکے ہیں (کلکتہ ۱۹۵۶ء)۔ اس مجموعے میں افسانے حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔ اور تجنیسِ حرفی ان کی خصوصیت ہے۔ مثلاً پہلا افسانہ ہے: الف کا افسانہ۔ اس میں بیشتر الفاظ ایسے ہیں جو 'الف' سے شروع ہوتے ہیں۔ دوسرے افسانے کا عنوان ہے: 'بُلے کی بوچھار'۔ اس میں استعمال شدہ الفاظ 'ب' سے شروع ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ مختلف اصناف میں کلامِ نظم ونثر کی بہت بڑی مقدار ایسی ہے، جو آج تک شائع نہیں ہوئی۔ یہ مسوّدات ان کے خاندان میں موجود ہیں۔
کلکتے کے ادبی حلقوں میں ان کی خاصی شہرت تھی، اور خواتین میں تو بلاشبہہ وہ صفِ اوّل کی ادیب شمار ہوتی تھیں۔
ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا، اگرچہ دیوان مرتب ہو چکا تھا۔
کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ چونکہ ان کی زندگی بیحد پریشانی میں گذری، خاص طور پر خانگی سکون بہت حد تک مفقود رہا، اس لیے ان کے شعروں میں بیچارگی اور تنہائی کا احساس ضرور ملتا ہے۔ ایک نظم اور چند شعر ملاحظہ ہوں:

مُرغِ نواریز

آہ لذّت کشِ غم، لُٹ گیا دل آج کے روز کون ہے نغمہ سرا
سچ ہے، انساں سے زیادہ ہے پرندہ پُرسوز جیسے کوئل کی صدا
درد، کوئل کی صداہیں، کبھی اتنا تو نہ تھا آخرش راز ہے کیا
شدّتِ دردِ جگر، آج ہوئی حد سے سوا تارِ اشکوں کا بندھا

آہ، ڈوبا ہوا دل بحرِ خموشی میں مرا یک بیک چیخ اٹھا
سوچتی تھی، یہ مری کس نے اجاڑی دنیا بھید کچھ بھی نہ کھلا
صبح دم، پھٹتے ہی پَو، میرا کلیجہ بھی پھٹا کس کی آئی یہ ندا
تیر اک آکے ترازو دلِ محزوں میں ہوا تن بدن کانپ گیا

شور، وہ بھی غم و تاثیر کا حامل اتنا اف، اماں، یارِ خدا!
تجھ کو کوئل کہ نقیبِ غمِ ہستی کہیے دل میں ہے حشر بپا
کیا خوش آیند ترانہ، تجھے آتا ہی نہیں؟ کچھ تو کہہ، بات ہے کیا؟
دکھ بھری تان بدل، نغمۂ راحت بن جا چھوڑ یہ طرزِ نوا

رہے شاعر سے ترا رشتۂ جاں بخش روا تجھ سے رنگیں ہو فضا
آئے کانوں میں کسی سمت سے جب تیری صدا اس کا مفہوم ہو کیا
واہ لذّت کشِ غم شاد ہے دل آج کے روز طائرِ نغمہ سرا
سازِ مخفی کے لیے وقف ہے، کوئل! ترا سوز اجر دے تجھ کو خدا

راہِ طلب میں جب ہو عزمِ سفر مکمّل خود انتظارِ منزل کرتی ہے کارواں کا

اس دل کو کس کی یاد نے دیوانہ کر دیا کس شمعِ بےمثال کا پروانہ کر دیا
میرے لیے حیات میں، کتنا جہان تنگ ہے کوئی بھی ہمنشیں نہیں، کوئی بھی ہمنوا نہیں

مری زیست غمزدہ ہے، مرا قلب رو رہا ہے یہی ہے مرا فسانہ، یہی ہے مرا ترانہ
کوئی مجھا اسیرِ تنہا کے نصیب پر نہ روئے ہے قفس بھی اک ٹھکانا، نہ رہا جب آشیانہ

شام ہی سے نکہتِ مشکِ ختن آتی رہی خواب میں حسبِ شب وہ زلفِ پُرشکن آتی رہی

ہر نَفَس پرِ عشق، میں ہوتا رہا، اک امتحان ہر قدم پر منزلِ دار و رسَن آتی رہی

ادائے حقِ وفا میں نہ کی کمی میں نے یہ جان جس کی امانت تھی، اس کو دی میں نے

دیا جہان کو اک درسِ زندگی میں نے نہ غم کو غم، نہ خوشی کو کہا خوشی میں نے

قرار کیا، مجھے دنیا میں موت بھی نہ ملی نہ جانے، کیسے گزاری ہے زندگی میں نے

مخفیؔ خستہ حال کی تو نے جو بات پوچھ لی شاد تجھے خدا کرے مقصدِ دل عطا کرے

تمنّا عمادی مجیبی پھلواروی، سیّد حیات الحق محمد محی الدّین

تمنّا مرحوم تین تین برگزیدۂ علم وفضل اور مسند نشین رشد وہدایت خانوادوں کے نام لیوا تھے۔ چھٹی پشت اوپر دادھیال میں تاج العارفین حضرت مخدوم شاہ مجیب اللہ قادری رح (ف ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۸ء) ان کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ تمنّا کے دادا (مولانا سفیر الحق عمادی) کے دادا نور الحق تپاں (ف ۱۲۳۳ھ) کی شادی جناب غلام نقشبند سجاد بن حضرت خواجہ عماد الدین رح قلندر بادشاہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اور ان کے دادا شاہ سفیر الحق (ف ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء) کے عقدِ نکاح میں قاضی مخدوم عالم کی صاحبزادی تھیں؛ اور خود قاضی مخدوم عالم کے حبالۂ عقد میں حضرت شاہ مجیب اللہ قادری رح کی پرپوتی تھیں۔ اسی لیے وہ اپنے نام کے ساتھ عمادی اور مجیبی کی نسبتیں لکھا کرتے تھے۔

تمنّا کے والد شاہ نذیر الحق شبِ یکشنبہ ۲۴ صفر ۱۲۵۹ھ (۲۶ مارچ ۱۸۴۳ء) کو پھلواری شریف (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ "چراغ مجیب" سے تاریخِ ولادت (۱۲۵۹ھ) نکلتی ہے۔ چونکہ گھر میں موروثی زمینداری تھی، اس لیے کسبِ معاش کی فکر سے آزاد تھے؛ ساری زندگی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزار دی۔ ان کا ۳ محرم ۱۳۲۳ھ (۱۰ مارچ ۱۹۰۵ء) کو پھلواری میں انتقال ہوا؛ لعل میاں کی درگاہ میں حضرت غلام نقشبند سجّاد کے مزار کے جوار میں مدفون ہیں۔ شعر بھی کہتے تھے؛ فائز تخلص تھا۔ کلام کا مجموعہ (دیوانِ فائز) ڈاکٹر خواجہ افضل امام (شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی) نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ (پٹنہ ۱۹۶۴ء)

شاہ نذیر الحق فائز نے دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی سربہدا (تھانہ خضر سرائے ضلع گیا) کی تھیں۔ ان سے دو بیٹیاں ہوئیں۔ بڑی، شادی کے بعد لاولد فوت ہوگئیں؛ چھوٹی کی اولاد موجود ہے۔ ان کی دوسری بیوی مبارک فاطمہ پھلواری شریف کے شاہ نور احمد نور کی صاحبزادی تھیں۔ نور خود بھی حضرت تاج العارفین شاہ مجیب اللہ قادری رح کے پرپوتے تھے۔ اس بیگم کے بطن سے فائز کے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھے۔ یہی صاحبزادے تمنا عمادی کے نام سے دنیائے علم وادب میں مشہور ہوئے۔

تمنا ۳ شوال ۱۳۰۵ھ (۱۴ جون ۱۸۸۸ء) کو پھلواری شریف میں پیدا ہوئے تھے۔ "فیروز بخت" سے تاریخ نکلتی ہے۔

والدین نے ان کا نام حیات الحق رکھا تھا، اگرچہ وہ مشہور اپنے ننھیالی نام محمد محی الدین سے ہوئے۔ انھوں نے خود اپنے نام کا سجع کہا تھا جس میں یہ دونوں نام تخلص سمیت موجود ہیں:

غلامے از غلامانِ محمد محی الدین حیات الحق تمنا

درسِ نظامی کی تکمیل اپنے والد حضرت نذیر الحق سے کی، گویا عربی اور فارسی میں منتہی تھے؛ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً مدرسۂ حنفیہ، پٹنہ میں ملازمت کی۔ یہ مدرسہ محمدی جان بیگم نواب یوسف حسین خان کا قائم کردہ تھا؛ اسی لیے بعض لوگ اسے مدرسۂ محمدی جان بھی کہتے تھے۔ یہاں وہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۸ء تک عربی اور فارسی کے مدرس رہے۔ اس کے بعد وہ تقریباً ساڑھے تین سال سابق صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کے قائم کردہ ودیا پیٹھ (بہار) میں عربی فارسی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں یہاں سے الگ ہوئے، تو پھر کسی ادارے کی ملازمت نہیں کی۔ اس کے بعد پٹنے کے بعض مسلمان وکلا ان سے قرآن پڑھنے لگے۔ یہ لوگ کچھ مالی خدمت بھی کر دیتے تھے۔ سر فخر الدین (ف ۱۹۳۳ء) فقہی معاملات میں بھی ان سے مشورہ کرتے رہے۔ جب ان کا انتقال ہوگیا، تو یہ عبدالعزیز

بیرسٹر (ف ۱۹۴۸ء) وزیرِ تعلیم بہار کے مشیرِ خاص اور دستِ راست بن گئے۔
عبدالعزیز صاحب بعد کو صدرِ امورِ مذہبی بن کر حیدر آباد (دکن) گئے، تو تمنّا کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ ریاستِ نظام سے ان کا بھی سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا تھا۔ یہ انھیں انضمام حیدر آباد (۱۹۴۸ء) تک باقاعدگی سے ملتا رہا۔
۱۹۴۸ء میں وہ اپنے اہل و عیال سمیت ہجرت کرکے ڈھاکے چلے گئے۔ اپنا کتابخانہ بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں حکومتِ پاکستان نے انھیں رہنے کو ایک وسیع مکان دے دیا تھا۔ علمی حلقوں میں بھی خاصی آؤ بھگت ہوئی۔ وہ مدّتوں ڈھاکہ ریڈیو سے قرآن کا درس نشر کرتے رہے۔ غرض یہاں معاش کے پہلو سے کوئی تشویش نہیں رہی، بلکہ خاصے خوش حال اور فارغ البال تھے۔ کئی سال بعد انھوں نے ڈھاکے سے نقلِ مکان کرکے چاٹگام میں اقامت اختیار کرلی، جہاں ان کے صاحبزادے محمد انعام الدین کا ٹھیکے کا کاروبار تھا۔
ان کی بعض تصانیف مدّت سے نامکمّل پڑی تھیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ ان کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں کہ کراچی میں قیام اختیار کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک آنکھ میں پانی اتر آیا اور رفتہ رفتہ بینائی نے جواب دے دیا تھا؛ اس پر آپریشن کی ضرورت تھی۔ اس لیے کراچی چلے گئے اور ایک عزیز کے وہاں قیام کیا۔ اس اثنا میں ان کے بیٹے محمد انعام الدّین نے بھی اپنا کام کاج کراچی منتقل کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء کے اواخر میں تمنّا عمادی ان کے پاس اٹھ گئے۔
آنکھ پر عملِ جرّاحی ہوا اور بینائی بحال ہو گئی۔ لیکن بدقسمتی سے ۱۹۷۲ء کے شروع میں حلق کے کینسر کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ علاج معالجہ بیسود، تکلیف میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ کھانا پینا بالکل ترک ہو گیا۔ کیونکہ کوئی چیز حلق سے نیچے اترتی ہی نہیں تھی۔ سیّال چیزوں میں سے دو چار گھونٹ یخنی، یا آدھی پیالی چائے، ان کی دن بھر کی خوراک رہ گئی تھی، یہ عمر اور اتنی مختصر خوراک! اسی میں ۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء (۲۰ شوّال ۱۳۹۲ھ) راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔

انھوں نے اپنی زندگی میں تین نکاح کیے۔ پہلی شادی اپنے ہی خاندان میں علی محی الدین پھلواروی کی صاحبزادی سے ہوئی؛ یہ ان کی سگی خالہ کی بیٹی تھیں۔ ان کے بطن سے ایک بیٹا (محمد امام الدین فائق) اور ایک بیٹی (ولیہؔ) پیدا ہوئے۔ محمد امام الدین نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق عربی تو پڑھنا ہی تھی، اس کے علاوہ کچھ انگریزی بھی پڑھی۔ لیکن ان کے دماغ میں کچھ خلل پیدا ہو گیا۔ وہ یکایک کہیں غائب ہو گئے اور باوجودِ تلاشِ بسیار پھر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

دوسرا نکاح برانواں (ضلع گیا) کے حافظ شاہ بلاقی کی صاحبزادی عزیز الفاطمہ کے ساتھ ہوا۔ ان کے بطن سے ایک بیٹا محمد انعام الدین اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بحمدہٖ یہ سب موجود ہیں۔ محمد انعام الدین چاٹگام میں انجینیر تھے، لیکن معلوم نہیں، کیا جی میں آئی کہ ملازمت سے مستعفی ہو کر ٹھیکے داری کرنے لگے؛ کراچی میں مقیم ہیں۔

ہندستان سے جلنے کے بعد انھوں نے ایک نکاح (تیسرا) مشرقی بنگال میں بھی کیا تھا۔ ان بیگم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ بھی ان کے ساتھ کراچی چلی گئی تھیں اور ان کا تمناؔ سے چند ماہ قبل وہیں ۱۹۷۲ء ہی میں انتقال ہوا۔

علم و فضل اور شعر گوئی تمناؔ کو گویا ورثے میں ملی تھی۔ وہ اردو، فارسی اور عربی، تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ زبان و بیان اور عروض میں مہارتِ تامہ تھی، جو انھوں نے اپنے والد سے سیکھے تھے۔ اسلامی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوّف، ہر ایک میں اجتہادی نقطۂ نظر تھا اور ان کی بیشتر تصانیف انھی علوم سے متعلق ہیں۔ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ مدّتوں وظائف و اوراد کے پابند رہے، بلکہ نا کھفیالی سلسلے میں خود حضرت مخدوم منہاج الدّین جیلانیؒ کے سجّادہ نشین بن سکتے تھے؛ لیکن قرآن کے غائر مطالعے کے بعد انھوں نے ان سب چیزوں سے کنارہ کر لیا، اور انھیں بدعت سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح انساب اور رجال اور تاریخ اسلام میں بھی ان کا مطالعہ اور واقفیت

غیر معمولی اور حیرتناک تھی۔

اردو کلام پر عبدالاحد شمشاد لکھنوی (ف ۱۹۱۷ء) سے اصلاح لی۔ فارسی اور عربی میں مولانا شبلی نعمانی (ف نومبر ۱۹۱۴ء) سے مشورہ کیا۔ شبلی کے تلمذ کا قصہ بروایت مولانا سید محمد جعفر پھلواروی بہت دلچسپ ہے۔

تمنا کے والد فارسی کے فاضل اور شاعر تھے۔ اسی سے انھیں بھی فارسی میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ بہت محنت سے کچھ غزلیں کہیں اور اصلاح کے لیے شبلی کی خدمت روانہ کیں۔ شبلی نے اس خط کے ساتھ انھیں واپس کر دیا:

> جس زبان میں آپ نے اشعار نظم کیے ہیں، وہ فارسی نہیں ہے، بلکہ اردو کا فارسی میں لفظی ترجمہ ہے۔ 'سے' کی جگہ 'از'، 'میں' کی جگہ 'در'، اور 'آیا' کی جگہ 'آمد' لکھ دینے سے فارسی نہیں ہو جاتی۔ اگر آپ فارسی میں شعر کہنا ہی چاہتے ہیں، تو کم از کم تیس برس تک اساتذہ کا کلام بغور دیکھیے اور پھر غزل کہہ کر بھیجیے؛ شاید قابلِ اصلاح ہو۔ لیکن شروع میں سعدی اور حافظ کا کلام قطعی نہ پڑھیے، بلکہ اپنے مطالعہ کو نظیری اور حزیں تک محدود رکھیے۔

اس خط سے مایوس تو ہوئے لیکن بےحوصلہ نہیں ہوئے اور فارسی کے مطالعے پر جٹ گئے۔ نظیری کی رنگینی پُرکشش تھی، اس لیے اسے خوب پڑھا؛ حزیں خشک اور ثقیل تھا، اس لیے اس سے اجتناب کیا۔ چھ ماہ بعد پھر غزل بھیجی، اور لکھا کہ میرا مطالعہ نظیری تک محدود رہا ہے، حزیں سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں کر سکا۔ جواب میں شبلی نے صرف ایک سطر لکھی:

> حزیں کے کلام کی طرف طبیعت کا راغب نہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی آپ کو فارسی نہیں آئی۔

یہ بھی دُھن کے پکّے تھے؛ نظیری کو چھوڑ کر حزیں کے لیے وقف ہو گئے۔ بتدریج وہ اسے سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔ مزید یہ کہ روزانہ مختلف

طرحوں میں کچھ شعر کہتے، خود ہی اس پر غور کرتے اور ضائع کر دیتے۔ سال بھر بعد پھر غزل شبلی کی خدمت میں بھیجی۔ جواب آیا:

> آپ کی ترقی کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ برسوں کا ریاض آپ نے مہینوں میں کیا ہے۔ مختصر یہ کہ اُس وقت آپ کی غزل قابلِ توجہ نہ تھی اور اب محتاجِ اصلاح نہیں۔

غرض یہ سلسلہ دو برس تک جاری رہا۔ انھیں خود اعتراف تھا کہ میری عربی اور فارسی کی نظم و نثر جو کچھ بھی ہے، یہ تمام و کمال مولانا شبلی کی مرہونِ منّت ہے۔

ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے؛ ان میں زیادہ تعداد مذہبی موضوعات کی ہے۔ جتنا ان کی زندگی میں چھپ سکا، کم از کم اس کے برابر مسودات کی شکل میں غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ ان کا بیشتر حصہ مولانا سیّد محمد جعفر پھلواروی (لاہور) کی تحویل میں ہے۔

اردو علم و ادب کے شائقین کی دلچسپی کی کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں: مثنوی مذہب و عقل، مثنوی معاش و معاد، ایضاحِ سخن (شوق سندیلوی کی کتاب اصلاحِ سخن کی دس شعر کی پہلی غزل پر اساتذۂ وقت کی اصلاحوں کا جائزہ)، رسالۂ تذکیر و تانیث، افعالِ مرکّبہ۔ ان کا نام ایک اور سلسلہ میں بھی یادگار رہیگا۔

۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے خانقاہِ عمادیہ منگل تالاب، پٹنہ کے کتابخانے کے پرانے مسوّدات میں سے دینی موضوع پر ایک مختصر رسالہ ڈھونڈ نکالا جو اردو نثر میں ہے۔ تمنّا کا دعویٰ تھا کہ یہ حضرت عماد الدّین قلندر پھلواروی کی تصنیف ہے۔ اس کا نام "سیدھا رستہ" (صراطِ مستقیم) تھا اور اس پر تاریخ ۲۲ ربیع الاوّل ۱۰۸۱ھ کی ثبت تھی۔ اگر یہ دعویٰ درست تسلیم کر لیا جائے، تو نہ صرف اس سے پرانی کوئی نثری تحریر اب تک بہار میں دستیاب نہیں ہوئی، بلکہ یہ پورے شمالی ہند کی سب سے پرانی نثر ہے، کربل کتھا سے بھی قدیم تر جس کی پہلی روایت ۱۱۴۵ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ لیکن بعض حلقوں کی طرف سے اس کی صحت پر شبہہ وارد کیا

گیا ہے۔
ملک کے مختلف حصوں میں ان کے شاگردوں کی کافی تعداد ہے۔ پروفیسر مختارالدین احمد (صدر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے کسی زمانے میں شاعری کی ہے؛ وہ آرزو تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے بھی تمنّا سے اصلاح لی ہے۔
افسوس، کہ ان کے اردو یا فارسی کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا، حال آں کہ ضخیم کلیّات کے برابر ذخیرہ ہوگا۔ چند غزلیں بڑی مشکل سے دستیاب ہوئیں؛ انھیں کا انتخاب درجِ ذیل ہے۔ زبان پر قدرت، محاورے اور روز مرّے میں استادانہ نگاہ، عروض کی ماہرانہ واقفیت ایک ایک مصرعے سے عیاں ہے۔

تم تمنّا سے کیوں نہیں ملتے
آدمی ہے بڑی مروت کا

گلشن میں دبے پانو، صبا! بچ کے نکلنا
مرقد میں تمنّا کی ابھی آنکھ لگی ہے

جو گیا شباب! تو ہی، تو گئیں وہ ساری باتیں
نہ وہ عشرتوں کے دن ہیں، نہ وہ راحتوں کی باتیں

تجھے میں بھلا دوں لیکن کبھی بھول سکتی بھی ہیں
تری بھولی بھالی صورت، تیری میٹھی میٹھی باتیں

کوئی توڑنے کی شے ہے شبِ وصل کا تصوّر
وہ مزے مزے کی چہلیں، وہ مزے مزے کی باتیں

نرگس سی آنکھ، سرو سا قد، برگِ گل سے لب
گلشن میں آج کون سراپا چمن گیا

رخ و زلف و ابرو و چشم و لب — کہو، کس کی کس کی سہے کوئی
ہیں ادھر تو دشمنِ جاں سبھی، اگر ایک ہو، تو سہے کوئی
وہ ملے کسی کو بھی آج تک کہ ملیں گے حضرتِ دل! تمھیں
فقط آرزو ہی میں رات دن جو رہے کوئی، تو رہے کوئی
مری سرگزشت ہے گفتنی، مرا ماجرا ہے شنیدنی
نہیں سنتے وہ، تو کہوں میں کیا؛ جو سنے کوئی، تو کہے کوئی
یہ ہزار طرح کی گالیاں، وہ بھی دشمنوں کی زبان سے
کہے جو بھی چاہے، بُرا بھلا، مگر اپنے منہ سے کہے کوئی

مرا قتل جرمِ وفا پہ ہے، میں ہوں اپنے جرم کا معترف
جو سزا ہو، میری ہی ہو سزا، مگر ان کو کچھ نہ کہے کوئی
نہیں چشم و گوش یہ کام کے، رہے عقل و ہوش تو نام کے
جو سہے مصیبتِ زندگی تو اب اس قدر نہ سہے کوئی
لگے کہنے آج یہ دیکھ کر کہ تمنّا ان کی گلی میں ہے
یہ ذرا پسند نہیں مجھے کہ مری گلی میں رہے کوئی

وہ فتنہ جو نقاب تو رخ سے جدا کرے — دنیا اگر ادھر کی اُدھر ہو، ہوا کرے

یہ بزمِ غیر سہی، اک ذرا نظر تو ملے — کہ آنکھوں آنکھوں میں تھوڑی سی گفتگو ہو جائے
ملیں، ملیں نہ ملیں، ہے یہاں تلاش کی دھن — خدا نکردہ، کہیں ختم جستجو ہو جائے

ساقی! گھٹا ہے، صحنِ چمن ہے، بہار ہے — اب کارِ خیر میں تجھے کیا انتظار ہے
تمکین جس نے ہاتھ سے کھوئی، وہ خوار ہے — خود رفتگی جو خاک میں آئی، غبار ہے

لب بند اور وقت ہے عرضِ نیاز کا — ہنگامہ زیرِ لب ہے سخنہائے راز کا
نغموں سے شوقِ دید کے تارِ نظر ہیں مست — ہر پردہ اپنی آنکھ کا پردہ ہے ساز کا

اک یقیں بالآخر اپنا ہر گماں بنتا گیا — خواب ہم دیکھا کیے، روز اک جہاں بنتا گیا
ہم گرے کتنی جگہ راہِ طلب میں سر کے بل — ہر جگہ گویا تمہارا آستاں بنتا گیا
رنگ اڑا، آنکھیں چڑھیں، پلکیں گریں، ہچکی بندھی — چپ لگی، تو لاکھ عنوانِ بیاں بنتا گیا
راہِ آزادی تو خود ہوتی ہے رہروِ آفریں — گردِ رہ اڑتی گئی، اور کارواں بنتا گیا

مجھ کو تمنّا! یاد ہے سجدہ پہ سجدہ پے بہ پے
ہائے تم اور یہ شغلِ مے! کوئی سنے، تو کیا کہے؟

سیّد احتشام حسین رضوی، پروفیسر

جونپور اور فیض آباد کے درمیان (اعظم گڑھ لائن کے قریب) ایک مختصر قصبہ سناگانو "ماہل" نامی ہے۔ یہاں سادات رضوی کی آبادی بہت پرانی ہے۔ انھیں میں ایک صاحب سیّد ابو جعفر رضوی ہوئے ہیں۔ وہ بڑے باہمّت اور ذہین شخص تھے۔ اگرچہ گھر کی کچھ اوسط درجے کی زمینداری تھی، لیکن اب اس سے آمدنی اتنی نہیں رہی تھی کہ گھر کے اُجلے خرچ کی کفیل ہوسکے۔ لہٰذا انھوں نے اس میں اضافہ کرنے کو ملازمت کا پیشہ اختیار کرلیا؛ اور واقعتاً بیشتر یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ جب ۱۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو ان کا انتقال ہوا ہے، تو سن ۴۵-۴۶ برس سے زیادہ نہیں ہوگا۔ ان کی وفات بہت افسوسناک حالات میں ہوئی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں سیّد ابو جعفر کسی کام سے کلکتے گئے، تو سیر کرانے کے لیے اپنے بڑے بیٹے احتشام حسین کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ سیر سپاٹا ختم کرنے کے بعد واپسی ہوئی، تو ریل کے جس ڈبّے میں یہ دونوں سوار تھے، اسی میں چیچک کے مرض میں مبتلا ایک اور مسافر ان کا ہمسفر تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس پر مرض کا زبردست حملہ ہوچکا تھا، اور وہ متواتر قے کررہا تھا۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، لیکن اس سے مفر کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ آخر وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا۔ گھر پہنچتے ہی دونوں باپ بیٹے چیچک کی گرفت میں آگئے۔ مرض اتنا شدید تھا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ سیّد ابو جعفر تو بالآخر اسی میں چل بسے، لیکن احتشام حسین کچھ دن کی دوا دوش کے صدقے بچ نکلے۔ جن لوگوں نے انھیں بعد کے زمانے میں

دیکھا ہے، انھیں معلوم ہوگا کہ ان کا منہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا؛ یہ اسی حادثے کی یادگار تھے۔

ابو جعفر نے اپنے پیچھے اولاد میں چار بیٹے (احتشام حسین، وجاہت حسین، انصار حسین، اقتدار حسین) اور ایک بیٹی چھوڑی۔ ان میں سیّد احتشام حسین سب سے بڑے تھے؛ ان کا والدہ کا نام زاہد النسا بیگم تھا؛ بفضلہ تعالیٰ یہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

اگرچہ سرکاری کاغذات میں سیّد احتشام حسین کی تاریخِ ولادت ۱۴ جولائی ۱۹۱۲ء درج ہے، لیکن وہ درحقیقت ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء کو ماہل سے آٹھ میل دور اتر ڈیہہ گاؤں میں پیدا ہوئے، جیسا کہ انھوں نے ایک مرتبہ میرے دریافت کرنے پر بتایا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں ماہل میں پلیگ کا دور دورہ تھا، اس لیے خاندان کا ان کے پھوپھا سیّد محمد قاسم حسین کے وہاں قیام تھا۔ ابتدائی تعلیم ماہل کے مڈل اسکول میں پائی۔ اس کے بعد اعظم گڑھ پہنچے اور یہاں کی قدیم آسٹریلیائی مشنری درسگاہ، ویزلی ہائی اسکول سے ۱۹۳۰ء میں دسویں درجے کی سند درجۂ اوّل میں اس امتیاز سے حاصل کی کہ ان کا نام اسکول کی اعزازی فہرست کے تختے پر لکھا گیا۔ یہ نام آج بھی وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں والد کا انتقال ہو چکا تھا اور گھر کے حالات اب مزید تعلیم جاری رکھنے کے لیے سازگار نہیں رہے تھے۔ چچا حکیم سیّد ابو محمد علیش نے بسباط بھر مدد کی، لیکن وہ بھی پورا بار اٹھانے سے معذور تھے۔ بھلا عزمِ محکم اور یقینِ کامل کے رستے میں کوئی شے کبھی حائل ہو سکی ہے! اگرچہ یہ زمانہ مسلسل کشمکش اور جدّ وجہد کا تھا، لیکن نوجوان احتشام حسین ہمّت نہیں ہارے۔ خوش قسمتی سے ان کے پھوپھا سیّد محمد قاسم حسین بسلسلۂ ملازمت الٰہ آباد میں مقیم تھے؛ وہ کوتوالِ شہر کے پیشکار تھے۔ انھوں نے اپنے پاس بلا لیا اور مقامی گورنمنٹ انٹر کالج میں داخل کرا دیا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کا تبادلہ باہر ہو گیا، تو احتشام صاحب سیّد لختِ حسنین (والدِ مصطفیٰ زیدی) کے مکان پر اٹھ گئے۔ سال بھر ان کے

ساتھ قیام رہا۔ ۱۹۳۲ء میں انٹر کے بعد بی اے میں داخلہ لیا تھا کہ کسی طرح ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین صدر شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی (ف فروری ۱۹۷۵ء) تک ان کی خبر پہنچی۔ انھوں نے ان کے رہنے کو اپنے مکان میں ایک کمرہ دے دیا۔ ۱۹۳۴ء میں بی اے کا امتحان درجۂ اوّل میں امتیاز سے پاس کرنے پر ایم اے میں تمغا اور وظیفہ ملا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں یہیں سے ایم اے (اردو) کا امتحان اس امتیاز سے پاس کیا کہ پوری یونیورسٹی میں اوّل آئے؛ درجۂ اوّل حاصل کیا اور آرٹ فیکلٹی کے بہترین طالب علم قرار پانے پر سونے کا تمغا ملا۔

اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ کے شعبۂ اردو میں مدرّس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ ۱۲۵ روپے مشاہرہ ملنے لگا۔ اور بارے، قدرے عافیت کی سانس لینا نصیب ہوئی۔

لکھنؤ سے ۲۷ میل دور نگرام نام کا ایک اچھا مشہور قصبہ ہے۔ یہاں ایک وکیل میر فدا حسین ہوئے ہیں۔ وہ اپنے پیشے میں بہت کامیاب ہوئے اور انھوں نے بڑی جاداد پیدا کی تھی، حتیٰ کہ وہ ساڑھے چھ ہزار سالانہ کے مالگزار بن گئے۔ ان کے کئی اولادیں تھیں۔ ان میں منجھلے بیٹے کا نام میر حسن عسکری تھا، جن کے دو بیٹیاں ہوئیں، بڑی کا نام کاظمی بانو تھا اور چھوٹی کا ہاشمی بانو۔ ان دونوں کی ایک ہی دن ۳۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو شادی ہوئی؛ بڑی شمیم کرہانی (ف مارچ ۱۹۷۵ء) کے عقدِ نکاح میں آئیں، اور چھوٹی سیّد احتشام حسین کے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منشی پریم چند (ف اکتوبر ۱۹۳۶ء) کی زیرِ صدارت لکھنؤ میں ہوئی۔ سیّد احتشام حسین اس تحریک کے آغاز ہی میں اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں ان کا مکان (محلہ بارودخانہ، گولہ گنج) ترقی پسندوں کی سرگرمیوں کا خصوصًا، اور دوسرے ادیبوں کا عمومًا مرکز بنا رہا۔ یہاں ہر اتوار کی شام انجمنِ ترقی پسند مصنفین کا جلسہ ہوتا؛ نظم و نثر کی تخلیقات پیش ہوتیں اور ان پر بحث و تمحیص ہوتی۔ یہ جلسے

تقسیم ملک تک جاری رہے۔ ان سے جہاں رفتہ رفتہ نوجوان لکھنے والوں کا مستعد گروہ تیار ہو گیا، وہیں خود سید احتشام حسین کو بھی اس سے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ ان کا ذاتی مطالعہ بہت گوناگوں تھا۔ وہ بہت تیز پڑھنے والے تھے؛ ضخیم سے ضخیم کتاب دو چار دن میں دیکھ جاتے۔ حافظہ بہت اچھا پایا تھا، جو پڑھتے، اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ رہ جاتا۔ انھیں اردو انگریزی کے علاوہ ہندی میں بھی پوری مہارت حاصل تھی۔ تاریخ اور فلسفہ اور ادب ان کے خاص موضوع تھے۔ اردو کا پورا سرمایہ تو انھیں دیکھنا ہی تھا کہ اس کا پڑھانا ان کے فرضِ منصبی میں داخل تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی کے واسطے سے عالمی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا، اور وہ مغربی ادب کی تحریکوں سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔ ان ہفتہ واری ادبی جلسوں میں ان کی تنقیدی صلاحیتیں بیدار ہوئیں، انھیں مختلف موضوعات پر فی البدیہہ تقریر کرنے اور بحث مباحثے میں حصہ لینے کی مشق ہوئی، اور یوں انھیں اپنے مطالعے کے نتائج کو نظریات اور اصولوں میں ڈھالنے کا موقع بھی ملا۔ بتدریج وہ ہماری زبان کے سربرآوردہ نقّاد اور ادیب تسلیم کر لیے گئے۔ غرض ان کا یہ لکھنؤ کا قیام ان کی شخصیت اور کردار کی تشکیل اور ارتقاء کے لحاظ سے بیحد اہم زمانہ ہے۔

سیّد احتشام حسین اگرچہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن نہیں رہے، لیکن اس میں بھی شبہہ نہیں ہے کہ وہ مارکسی نقطۂ نظر کے ہمدرد تھے۔ ان کی تحریروں میں جہاں تہاں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ ادب اور زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کے خلاف تھے۔ اسی لیے وہ روایت اور ماضی سے رشتہ منقطع کرنے کو بھی غلط سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ادب اور سماج کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان پر الگ الگ بحث کرنا نہ صرف مفید نہیں ہو سکتا، بلکہ بسا اوقات یہ غلط نتائج تک پہنچا دیتا ہے۔

ادبِ اردو کے میدان میں ان کی حیثیت مسلّمہ تھی۔ سب حلقوں میں ان کی رائے

وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ فروری ۱۹۵۲ء میں امریکا کے مشہور رادارے راک فیلر فاؤنڈیشن نے انھیں پیشکش کی کہ وہ اس کے خرچ پر امریکا اور انگلستان ہو آئیں۔ بظاہر کوئی خاص منصوبہ مدِّ نظر نہیں تھا؛ بس جائیں اور ان ملکوں کے مصنّفوں، پروفیسروں، دانشوروں، ناشروں، سربرآوردہ لوگوں سے ملیں؛ ان سے گفتگو کرنے کے بعد دیکھیں اور مشورہ دیں کہ ہندستان کی ادبی زندگی کی تنظیم اور یہاں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور ان کی تصنیفات کی اشاعت کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ احتشام حسین کی آرا اور میلانات کسی سے مخفی نہیں تھے۔ اس لیے وہ متعجب تھے کہ امریکا سے یہ دعوت آنے کی لِم کیا ہے؟ اسی لیے وہ اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن سب اعزّہ و احباب نے اصرار کیا کہ ایسے موقعے روز روز نہیں ملتے، دعوت قبول کرلو۔ بالآخر بہت حیص بیص کے بعد انھوں نے یہ پیشکش منظور کرلی۔ وہ ستمبر ۱۹۵۲ء میں یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ امریکا کی مختلف یونیورسٹیوں میں پھرے، پروفیسروں سے ملے جلے؛ ان کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں سربرآوردہ لوگوں سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں وہ امریکا سے انگلستان چلے آئے۔ وہی پروگرام یہاں لندن، آکسفرڈ، کیمبرج میں بھی رہا۔ اسی دوران میں چند دن کے لیے پیرس کا ایک چکّر بھی کاٹ آئے۔ بالآخر نو دس مہینے کی غیر حاضری کے بعد جولائی ۱۹۵۳ء میں واپس وطن پہنچے۔ ان کی کتاب "ساحل اور سمندر" اسی سفر کی ڈائری ہے۔

معلوم نہیں، راک فیلر فاؤنڈیشن نے جس مقصد سے انھیں امریکا جانے کی دعوت دی تھی، وہ پورا ہوا یا نہیں۔ لیکن اس سفر سے پروفیسر احتشام حسین کو یقیناً بہت فائدہ پہنچا۔ سیاحت اور مختلف ملکوں کا سفر ہر حال میں تعلیم کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی لیے سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کا ارشادِ خداوندی ہے۔ امریکا اور انگلستان میں انھیں وہاں کے اساتذۂ ادب اور اساطینِ فکر و نظر سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کرنے کا

موقع ملا۔ سونا کسوٹی پر چڑھ کر کندن بن گیا۔

۱۹۶۱ء میں ان کے استاد ڈاکٹر اعجاز حسین شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی کی صدارت سے سبکدوش ہوئے، تو ان کی جگہ انھیں ملی، اور وہ الٰہ آباد منتقل ہو گئے۔ اب ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ ملک کی کوئی اردو تحریک ان کے مشورے سے محروم نہیں تھی، وہ ہر جگہ قولاً اور فعلاً اس میں سرگرمی سے حصّہ لینے لگے تھے۔ ان یونیورسٹیوں میں، جہاں اردو کا شعبہ تھا، بیشتر عزل و نصب میں ان کی رائے کا دخل تھا۔

۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی بڑے جوش و خروش سے منائی گئی تھی، ہندستان میں اس سلسلے میں جو کچھ ہوا، وہ سب کے علم میں ہے۔ بیرونی ممالک میں سے روس نے اس بارے میں خاص اہتمام کیا اور ہندستان سے بھی کچھ لوگوں کو ان تقریبات میں شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ پانچ اصحاب کا ایک وفد روس گیا تھا۔ اس وفد کے لیڈر ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ف فروری ۱۹۷۶ء) تھے اور اراکین میں پروفیسر سیّد احتشام حسین، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری اور یہ خاکسار تھے۔ ہم لوگ ۱۴ مئی ۱۹۶۹ء کو یہاں سے روانہ ہوئے اور ۳۱ مئی ۱۹۶۹ء کو واپس آئے۔ ہم ازبکستان اور تاجکستان کے متعدد شہروں کے علاوہ موسکو اور لینن گراڈ بھی گئے تھے۔ ان دو ہفتوں میں مجھے سیّد احتشام حسین کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے ہر موقع پر اپنی ذہانت، حاضر جوابی، علم کی وسعت، اور خیالات کی پختگی کا ثبوت دیا۔ وہ ساتھ کے ساتھ اس سفر کا روزنامچہ بھی لکھتے رہے تھے۔ نہ جانے، یہ آج تک شائع کیوں نہیں ہوا!

انھوں نے ۱۹۷۲ء میں ۶۰ برس پورے کر لیے تھے اور قاعدے کے مطابق عنقریب ملازمت سے سبکدوش ہونے والے تھے۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ اس کے بعد لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کریں گے۔ چنانچہ وہاں اپنے پرانے مسکن بارود خانہ کے نواحی احاطۂ ممتاز حسین میں ایک مکان بھی خرید لیا تھا۔ لیکن تدبیر کند بندہ و تقدیر

کنند خندہ۔ ان کی صحت بالعموم بہت اچھی رہی تھی؛ معدے کی کبھی کبھی شکایت کرتے تھے۔ لیکن جمعہ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء صبح ساڑھے آٹھ بجے یک لخت دل کے درد کا شدید دورہ پڑا، اور اس سے پیشتر کہ طبی امداد پہنچ سکے، آناً فاناً روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ جنازہ اگلے دن سنیچر کو اٹھا؛ کربلا، الہ آباد میں آخری خوابگاہ نصیب ہوئی۔ نمازِ جنازہ سنّی اور شیعی حضرات نے الگ الگ پڑھی۔ ملک بھر میں جس وسیع پیمانے پر ان کا ماتم ہوا، وہ ان کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت پر دال ہے۔

متعدد اصحاب نے تاریخِ وفات کہی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (لکھنؤ) نے حالی کے مرثیۂ غالب کے ایک مصرعے: "رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج" سے تاریخ نکالی؛ اس سے ۱۹۷۲ء برآمد ہوتے ہیں۔ پروفیسر سید حسن سرمدؔ (شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی) نے ہجری میں قطعہ کہا؛ اس کی آخری بیت تاریخ ہے:

یہ ان کی موت کی سرمد نے ہے لکھی تاریخ
"جہاں کا فاجعہ ہے مرگِ احتشام حسین"!

(۱۳۹۲ھ)

جسمانی یادگاریں چھ بچے چھوڑے، چار بیٹے: جعفر عباس (محمد میاں)؛ جعفر عسکری (عون میاں)؛ ارشد حسین (ارشد میاں)؛ جعفر اقبال (اقبال میاں) اور دو بیٹیاں (سعیدہ اور ثریا)۔

ان کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب افسانوں کا مجموعہ ہے جو "ویرانے" کے نام سے شائع ہوا تھا (الہ آباد ۱۹۴۳ء) یہ دوسری مرتبہ ۱۹۴۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ تنقیدی جائزے (حیدر آباد ۱۹۴۴ء) یہ بعد کو الہ آباد سے ۱۹۴۵ء میں اور لکھنؤ سے ۱۹۵۱ء میں اور اس کے بعد بھی چھپی؛ روایت اور بغاوت (حیدر آباد ۱۹۴۷ء نیز ۱۹۵۶ء)؛ ادب اور سماج (بمبئی ۱۹۴۸ء)؛ تنقید اور عملی تنقید (دلی ۱۹۵۲ء)، ذوقِ ادب اور شعور (لکھنؤ ۱۹۵۵ء)؛ ساحل اور سمندر (لکھنؤ ۱۹۵۴ء)؛

اردو ساہتیہ کا اتہاس (ہندی میں) (علی گڑھ ۱۹۵۵ء) اسی کا دوسرا ایڈیشن "اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس" کے عنوان سے ۱۹۷۰ء میں الٰہ آباد سے شائع ہوا، اس کا ترجمہ روسی زبان میں بھی ہوا ہے عکس اور آئینے (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۲ء)؛ افکار و مسائل (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۳ء)؛ تنقیدی نظریات (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۰ء)؛ اعتبارِ نظر (لکھنؤ ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۵ء)؛ کلکی از رادھا کرشنن کا ترجمہ (دلّی ۱۹۶۱ء)؛ دویکانند از رومیں رولاں کا ترجمہ (دلّی ۱۹۶۳ء)؛ گنجی کی کہانی از مور اسکی (دلّی ۱۹۷۰ء) انتخاب آبِ حیات (دلّی ۱۹۷۲ء)

غیر مطبوعہ کتابوں میں "جوش اور اس کا فن" اور "سفر نامۂ روس" زیادہ اہم ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ تاریخِ ادبِ اردو مرتب کر رہے تھے۔ افسوس کہ اسے مکمّل نہ کر سکے۔ بہر حال جتنا حصہ بھی لکھا گیا، اسے محفوظ کر دینا چاہیے۔

مرحوم شعر بھی کہتے تھے اور کبھی کبھی احباب کے اصرار پر مشاعرے میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ زندگی میں کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ وفات کے بعد یہ مختصر سرمایہ "روشنی کے دریچے" کے عنوان سے چھپا (الٰہ آباد ۱۹۷۳ء)۔

آخری زمانے میں انھوں نے ایک قلمی نام: "ا۔ح نورازل" اختیار کر لیا تھا اور اس کے تحت نظمیں لکھا کرتے تھے۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ کیا بات یہ نام اختیار کرنے کی محرّک ہوئی۔ وہ نظمیں اس سے پہلے بھی لکھتے رہے تھے، اور یہ قلمی نقاب اوڑھنے کے بعد جو منظومات انھوں نے پیش کیں، ان میں پہلے کلام سے کوئی مابہ الامتیاز خاص بات بھی نہیں ہے۔ ان کا عنوان انھوں نے "آوازیں" رکھا تھا؛ یہ بھی اسی مجموعے (روشنی کے دریچے) میں شامل ہیں۔

اب نمونے کے چند شعر دیکھیے:

مت سمجھ آسودۂ ساحل ہمیں، اے ہمنشیں!
آپڑا جب وقت، طوفانوں سے ہم ٹکرا گئے

بستیاں ہوتی گئیں برباد، ویرانے بڑھے
ہم یونہی منزل بمنزل جانبِ صحرا گئے

اک ادھورا خواب بن کر رہ گئی ہے زندگی
اے خیالِ دوست! اب تجھ سے بھی ہم گھبرا گئے

تُو تو خاموش ہی رہا لیکن سن لیا شوق نے جواب ترا

گرچہ آغازِ محبت نے دیے ہیں دھوکے لیے جاتی ہے کہیں کاوشِ انجام مجھے

کچھ ایسی ہی گذری ہے کہ خوں ہو گیا دل بھی
آنکھوں کو لہو رونے کا ارمان تو نہیں ہے

روشن نہ سہی صبحِ وطن، اے دلِ پُرشوق
بیرونقیِ شامِ غریباں تو نہیں ہے

کیا دلپذیر صبح تھی، کیا دلنواز شام! جاتے ہی ان کے رونقِ شام و سحر گئی

نگاہِ دوست باندازِ التفات ملی اب اور چاہیے کیا، دولتِ حیات ملی
مری وفا کو تغافل کا ہو گیا دھوکا اس احتیاط سے وہ چشمِ التفات ملی

کبھی کبھی تو تری یادیں ملا وہ سکوں کہ دردِ ہجر پہ ہم اعتبار کر نہ سکے

جیسے کہیں سے دولتِ کونین مل گئی کیسا حسین وعدۂ بے اعتبار ہے
اک گردشِ دوام ہے ذرّوں کی زندگی کیسا کھلا فریب خیالِ قرار ہے

عادت سی ہو گئی ہے، وگرنہ ترا اقرار تھا اعتبار پہلے، نہ اب اعتبار ہے

کیوں کر کہوں کہ قرب ترا بے اثر رہا لیکن غمِ فراق کی لذّت ہی اور ہے

ظاہر نہ کر سکا میں اسے اشک و آہ سے اے دوست میرے غم کی حقیقت ہی اور ہے

جب سے غم کا ہوا ہوں رمز شناس یاس کرتی ہے بیقرار، نہ آس

کل تو خیر، ان کی یاد آئی تھی آج کیوں ہے، فضا اداس اداس!

حسن ناز اں ہے جس تغافل پر عشق کو بھی وہ بات آتی ہے

کوئی تو بات تھی اہلِ جنوں کے تیور میں اٹھی ہیں سب کی نگاہیں جہاں سے گزرے ہیں

یقیں کی منزلِ پُرخار تک پہنچنے میں ہزار محشرِ وہم و گماں سے گزرے ہیں
ندیم! پوچھ نہ اِس وقت کیفِ سرشاری دیارِ کاکلِ عنبر فشاں سے گزرے ہیں

اے دوست ہیکدے میں یہ کیسی ہوا چلی سب فتنہ ہائے دَیر و حرم یاد آ گئے
ایک ایک کر کے ٹوٹ چکے ہیں خرد کے بُت بتخانۂ جنوں کے صنم یاد آ گئے

بچا کے سب کی نظر جس سے دیکھتے ہو مجھے
ہزار طرح کی لذّت اُس اک نگاہ میں ہے

آشفتگی بڑھے، تو بڑھے؛ لیکن اے ندیم! ہو ساری رات زلفِ شکن در شکن کی بات

تلاشِ نور میں ظلمت بھی کام آتی ہے خزاں کی گود میں نخلِ بہار پلتے ہیں
تری نگاہ جگاتی ہے شوق کا جادو جو اک چراغ بجھے، سو چراغ جلتے ہیں

ناموسِ وفا کی پاسبانی لے جاؤں کہاں یہ چشمِ پُرنم!

رسم ہی شہرِ تمنا سے وفا کی اٹھ جائے اس طرح تو نہ کوئی اہلِ محبت کو ستائے
اپنی ذلّت کی صلیب آپ لیے پھرتا ہوں یہ بڑا بوجھ، محبّت کے سوا کون اٹھائے!

تجھے پسند جو دل کی لگن نہیں آئی مجھے بھی راس تری انجمن نہیں آئی

کچھ مرے شوق نے در پردہ کہا ہو جیسے آج تم اور ہی تصویرِ حیا ہو جیسے
یوں گذرتا ہے تری یاد کی وادی میں خیال خارزاروں میں کوئی برہنہ پا ہو جیسے

یقینِ عشرتِ فردا نہیں، تو کچھ بھی نہیں
نظر میں صبح کا جلوہ نہیں، تو کچھ بھی نہیں

نہ دردِ زیست، نہ حسنِ نظر، نہ ذوقِ جمال
جنوں کے کبھی نہ ہوئے کچھ، خرد سے بیگانے
انھیں سُلادو، پلا کر شرابِ کم نظری
کہ سنگ و خشت سے رُکتے نہیں یہ دیوانے

جب ترا غم بھی ساتھ دے نہ سکا مجھ پہ گذری ہیں ایسی راتیں بھی

دل تری یاد میں ہر لحظہ تڑپتا بھی نہیں بند ہو جائے تڑپنا، یہ گوارا بھی نہیں

وہ نہیں پاس، تو احساسِ رفاقت ہے سوا   غمِ تنہائی کے زنداں میں، مَیں تنہا بھی نہیں

کر تو لیں ترکِ تمنّا کا ارادہ، لیکن   قہر یہ ہے، وہ فسونگرِ ستم آرا بھی نہیں

جب تم نہیں تو زہر ہیں دنیا کی لذّتیں   کیسی بہار، آگ لگا دو بہار میں

ہزار رنگ میں غزلیں کہیں، مگر اے دوست!   تری نگاہ کا پیرایۂ بیاں نہ ملا

ہمنشیں! نکہتِ برباد کا ماتم کب تک!   پھول ہر روز تو کھلتے ہیں گلستانوں میں

نشاطِ نغمہ بھی کیوں بن گئی فغاں جیسے   چبھی ہے سینۂ احساس میں سناں جیسے

خیال بنتے ہیں، مٹتے ہیں، پھر ابھرتے ہیں   بپا ہے دل میں کوئی محشرِ نہاں جیسے

وہ تیرا پیرہنِ سُرخ، وہ خرامِ جواں   سفینہ رنگ کے دریا میں ہو رواں جیسے

آنکھیں کھلیں، تو دھوپ نے لے لی تھی وہ جگہ   سوئے تھے تیرا سایۂ دیوار دیکھ کر

نہ بزمِ دوست، نہ صحنِ چمن، نہ رُوئے نگار   فریبِ شوق میں اب تک گزر رہی ہے بہار

افق سے رنگ کئی پھوٹ کر زمیں پہ گرے   ابھی اڑا تھا مری چشمِ آرزو سے غبار

انھیں کو وقت نے سونپی ہے آج راہبری   کہ جن کے نقشِ قدم سے ہیں راستے بیزار

حفیظ ہوشیارپوری، شیخ عبدالحفیظ سلیم

اگرچہ حفیظ اپنے آبائی وطن ہوشیارپور کی نسبت سے مشہور ہوئے، لیکن ان کی ولادت ۵ جنوری ۱۹۱۲ء (۱۵ محرم ۱۳۳۰ھ) کو دیوان پور (ضلع جھنگ، پاکستان) میں ہوئی تھی، جو لائل پور سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب حکومتِ پنجاب نے منٹگمری، لائل پور، جھنگ وغیرہ کے مغربی اضلاع میں آبادکاری کا کام شروع کیا تھا۔ یہ علاقہ پہلے بنجر اور بالکل غیر آباد تھا۔ حکومت نے یہاں صاحبِ اثر زمینداروں اور ان اشخاص کو جن کی کچھ سرکاری یا فوجی خدمات تھیں، بڑے وسیع پیمانے پر جاگیریں عطا کیں اور انھیں خاص مراعات دے کر علاقے کے آباد کرنے کی ترغیب دی۔ عبدالحفیظ کے خاندان کی مالی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ ان کے والد شیخ فضل محمد خان تلاشِ روزگار میں وہاں گئے تھے کہ ممکن ہے کسی زمیندار کے ہاں کچھ لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے۔ اس میں وہ کامیاب ہوئے اور یوں انھوں نے دیوان پور میں سکونت اختیار کر لی۔

شیخ فضل محمد خان کے تین بیٹے تھے: عبدالرشید، عبدالحفیظ، عبدالمجید۔ عبدالرشید وہی ہیں، جو دنیائے ادب میں راحل ہوشیارپوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ تاریخ گوئی میں خاص طور پر ان کی مہارت مسلّمہ تھی۔ ان کی اردو، فارسی کی تعلیم معقول طریقے پر ہوئی تھی اور اس میں وہ اپنے نانا شیخ غلام محمد کے شاگرد تھے۔ جو پرانی وضع کے اچھے عالم تھے۔ شیخ عبدالرشید کچھ عجیب مراقی مزاج کے

شخص تھے۔ سنا ہے کہ دن رات گھر کے ایک کمرے میں گوشہ نشین رہتے، اور بہت کم باہر نکلتے تھے۔ دن میں ایک وقت کھانا کھاتے اور جو شخص کھانا لاتا، اسی کے ہاتھ رقعہ بھیج کر، کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہوتی، تو کار برآری کر لیتے۔ اگر کبھی کمرے سے نکلنا منظور ہوتا، تو رقعہ بھیج دیتے کہ میں فلاں دن، اتنے وقت کے لیے، برآمد ہونگا، اور فلاں فلاں شخص سے ملونگا، اور اس کی سختی سے پابندی کرتے سب سے چھوٹے عبدالمجید کی تعلیم بھی معمولی تھی اور اس کی زندگی بھی بہت غیر منظم تھی۔ گھر کے لوگ ہمیشہ اس کے اطوار سے بہت نالاں رہا کیے۔

عبدالحفیظ کی دسویں درجے تک کی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول، ہوشیار پور میں ہوئی۔ اس کے بعد وہیں گورنمنٹ انٹر کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ حال آں کہ مالی حالات اعلا تعلیم کا بار برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے، اس کے باوجود انھوں نے تہیہ کر لیا کہ تعلیم ضرور مکمّل کرونگا۔ چنانچہ لاہور چلے گئے اور گورنمنٹ کالج کے بی۔ اے کے درجے میں داخلہ لے لیا۔ لاہور میں سب سے مشکل مرحلہ سکونت کا تھا۔ یہ اس طرح حل ہو گیا کہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم نے انھیں اپنے ہاں رہنے کی اجازت دے دی۔

حفیظ کے ایک ماموں شیخ دین محمد تھے۔ ان کا ہوشیار پور ہی میں کپڑے کا کاروبار تھا اور وہ خاصے متمول آدمی تھے۔ وہ کبھی کبھی کچھ سلوک کر دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ لاہور میں حفیظ کا تعلیمی زمانہ بہت عُسرت میں اور تنگی ترشی سے بسر ہوا۔ بسر اوقات کے لیے وہ خالی اوقات میں نجی طور پر طالبعلموں کو پڑھاتے اور بعض رسائل و جرائد میں بھی اجرت پر کام کرتے۔ اسی زمانے میں ان کا شمس العلماء سیّد ممتاز علی (ف جون ۱۹۳۵ء) کے ادارے دارالاشاعت اور ان کے پرچے پھول سے تعلق پیدا ہوا۔ بالآخر انھوں نے ۱۹۳۳ء میں بی اے اور ۱۹۳۶ء میں ایم اے (فلسفہ) کی اسنادلیں۔

۱۹۳۶ء ہی میں میاں بشیر احمد (ف مارچ ۱۹۷۱ء) ایڈیٹر ہمایوں نے "انجمن اردو

پنجاب" کی بنیاد رکھی تھی۔ حفیظ تعلیم سے تو فارغ ہو ہی چکے تھے، اس انجمن کے نائب سکتر مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں "ادبی دنیا"، اور چراغ حسن حسرت کے "شکدان" کے ادارۂ تحریر سے بھی منسلک رہے

۱۹۳۸ء میں سید امتیاز علی تاج (ف اپریل ۱۹۷۰ء) نے انھیں 'پھول' اور 'تہذیب نسواں' کے ادارۂ تحریر میں لے لیا۔ اس کے کچھ مدت بعد ہفتہ وار 'ریاست' دلی میں جگہ مل گئی، تو یہاں چلے آئے۔ لیکن نبھ نہ سکی، اور چند ماہ بعد واپس لاہور چلے گئے۔

اب ان کا کام اور نام غیر معروف نہیں رہا تھا۔ چنانچہ بعض احباب کی وساطت سے ۱۹۴۰ء میں ریڈیو کے محکمے میں ملازمت مل گئی۔ اور وہ پروگرام اسسٹنٹ بن کر دلی آ گئے۔ اسی سلسلے میں چندے ان کا قیام بمبئی میں بھی رہا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد پھر اسی محکمے میں مدتوں لاہور میں قیام رہا۔ جون ۱۹۵۳ء میں دوسری مرتبہ کراچی میں تقرر ہوا اور زینہ بزینہ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ وہیں سے ۱۹۶۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد بھی اپنی وفات تک ریڈیو پاکستان کی دینی نشریات کے مشیر رہے۔

انھیں تنفس کا عارضہ بہت دن سے تھا۔ کبھی کبھی حالت زیادہ خراب ہو جاتی تھی۔ جولائی ۱۹۷۲ء میں شدید حملہ ہوا، تو اسپتال چلے گئے۔ طویل علاج سے کچھ افاقہ ہوا تو گھر واپس آ گئے۔ لیکن دو تین دن بعد ہی حالت بگڑ گئی اور وہ دوبارہ جناح اسپتال (کراچی) پہنچے۔ وہیں بدھ کے دن ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء صبح گیارہ بجے انتقال ہو گیا۔ اسی شام جنازہ اٹھا اور ہاؤسنگ سوسائٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

کئی اصحاب نے تاریخ وفات کہی۔ ان میں سے بیشتر کو "آہ حفیظ خوش بیاں" (۱۹۷۳) میں توارد ہوا۔ چنانچہ حکیم محمد حسین عرشی امرتسری کا قطعہ تاریخ ہے:

چو رخت بست زیں جہاں بجانبِ جناں حفیظ
غمِ فراق ترکہ داد بہرِ دوستاں حفیظ
برائے سالِ رحلتش بکنجِ فکر پا زدم
زہاتف آمد ایں ندا کہ "آہ خوش بیاں حفیظ"
(۱۹۷۳ء)

صلاح الدین گوہر حزیں کا قطعہ ہے:

کر گئے تاراج بزمِ علم و فن عبد الحفیظ
اب کہاں سے لائینگے ان کی زباں، ان کا قلم
شاعرِ شیریں نوا، روحِ ادب، جانِ غزل
میہمانِ قدسیاں ہو کر چلے سوئے عدم
حسن زبانِ بلبلِ باغِ جناں سے سالِ وصل
اور کہہ دیئے "شادہیں عبد الحفیظ اندر ارم"
۲
(۲ + ۱۹۷۱ = ۱۹۷۳)

حفیظ کی طبیعت شروع سے حسن پرست تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہو جاتے۔ اوّلاً انھوں نے بھی اپنے نانا شیخ غلام محمدؐ سے استفادہ کیا۔ جب ۱۹۳۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا، تو اپنے بڑے بھائی شیخ عبد الرشید راحل سے رجوع کیا۔ لاہور پہنچے، تو یہاں انھیں حلقۂ اربابِ ذوق کے نامور اراکین کی صحبت نصیب ہوئی؛ خاص طور پر صوفی غلام مصطفےٰ تبسمؔ اور سیّد احمد شاہ بخاری پطرس کی سرپرستی نے ان کے ادبی ذوق پر جلا کی؛ یہ دونوں کالج میں ان کے استاد بھی تھے۔ پطرس کی ترغیب پر انھوں نے انگریزی ادب کا بھی وسیع مطالعہ کیا، بلکہ طالبعلمی کے دور میں انھوں نے انگریزی میں بھی کچھ نظمیں کہی تھیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے بچوں کے لیے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے، جو "دورنگی" کے عنوان سے غالباً دار الاشاعت نے شائع کیے تھے۔ اس میں اصل انگریزی نظمیں بھی شامل ہیں۔

اوّل بہت دن تک سلیم تخلص کرتے رہے۔ بعد کو معلوم نہیں، کیوں اسے ترک کر دیا اور حفیظ تخلص اختیار کر لیا۔ وہ غزل اور نظم دونوں کہتے تھے۔ اوائل میں انھوں نے کچھ گیت بھی لکھے، بلکہ کسی زمانے میں وہ سیاسی نظمیں بھی لکھتے

رہے۔ جو تھے وہ ہیں مہر اور سالک کے روزنامہ اخبار "انقلاب" (لاہور) میں جو نظمیں "انقلاب کے خاص شاعر کے قلم سے" چھپی تھیں، ان کے لکھنے والے حفیظ اور احمد ندیم قاسمی تھے۔ (ندیم کو چاہیے کہ وہ تعین کر دیں کہ ان میں سے کونسی نظمیں حفیظ کی ہیں) لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا اصلی میدان غزل تھا۔ ان کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ کے علاوہ فکر کا پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔ ان پر میر کا اثر ضرور تھا، جو زبان کی سادگی، لہجے کے دھیمے پن، اور تحت الشعور کی غمناکی اور افسردگی سے عبارت ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی انفرادیت نے ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی شستگی، شایستگی اور شیرینی پیدا کر دی ہے۔ اس کے علاوہ انھیں اپنے برادر بزرگ کی طرح تاریخ گوئی میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ بیتکلف، تعمیہ یا تخرجہ کے بغیر، مکمل تاریخ نکالتے تھے۔ وہ بیحد زُود گو اور برجستہ گو تھے، لیکن پُر گو نہیں۔ فی البدیہہ پیروڈی اور ہزل کہنے میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ اپنے قریبی اور ہمراز دوستوں کی محفل میں خوب چہکتے تھے۔ غالباً یہ کلام محفوظ نہیں رہا۔

مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا تھا۔ انھوں نے اسے دو جلدوں میں مرتب کر لیا تھا؛ ہر ایک جلد میں بیس بیس سال کا انتخاب تھا اور کلیات کا نام انھوں نے 'زیرِ لب' رکھا تھا، یہ نام بعد کو ایک اور صاحب نے اڑا لیا اور اپنی بیوی کے خطوط اس عنوان سے شائع کر دیے۔ اس پر معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ بہر حال یہ دونوں حصے ان کی وفات کے بعد ایک جلد میں "مقامِ غزل" کے عنوان سے شائع ہوئے (کراچی ۱۹۷۳ء)؛ اس میں صرف غزلیات کا انتخاب ہے۔ تاریخوں کا مجموعہ الگ شائع ہوگا۔ انھوں نے کسی زمانے میں سندھی اکاڈیمی کی فرمائش پر ہیر رانجھا کے قصے پر مبنی سندھ میں تصنیف کردہ چار فارسی مثنویاں بھی مرتب کی تھیں؛ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے (کراچی ۱۹۵۷ء)۔

اولادِ جسمانی میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بڑی بیٹی (صبیحہ حفیظ

نے امریکا سے ڈاکٹریٹ کی تھی؛ وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ عمرانیات سے منسلک ہے۔ دوسری بیٹی (ثمینہ) ریڈیو پاکستان میں ملازم ہے۔ تیسری کا نام عصمت ہے۔ لڑکوں کے نام صہیب اور عمیر ہیں۔

حفیظ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے کچھ نظمیں ضرور لکھیں، لیکن بعد کو یہ میدان یکسر ترک کر دیا۔ جو کلاسیکی رچاؤ، وقار، رکھ رکھاؤ انھوں نے اپنی غزل میں نمایاں کیا، وہ ان کے معاصرین میں سے بہت کم شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ ان کی وضعداری اور کردار کی استواری کا یہ اعجاز ہے کہ نظم کے اس سیلاب میں، جو ان کے چاروں طرف رواں دواں تھا، اور جس میں ان کے تمام دوستوں کے پانوٴ ڈگمگا گئے، وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔ نمونے کے چند شعر دیکھیے:

خامشی ہے زبانِ عشق حفیظ! حسن اگر بدگماں نہ ہو جائے

دیکھی ہیں جفائیں بھی بہت عشق میں، لیکن اب کچھ بھی نہیں دل کو بجز مہر و وفا یاد

یہ ترکِ محبّت ہے کہ تجدیدِ محبّت پہلے سے بھی آنے لگے وہ مجھ کو سوا یاد

تھا میں یہ حال تھا، گویا اک شکل تھی پہچانی ہوئی، نام نہ تھا یاد

جب کھلی آنکھ خیال ان کا! لگی آنکھ تو خواب بڑی مشکل سے بسر رات ہوئی ہے مجھ سے

کہاں سے لاؤں عمرِ جاودانی ترا پیماں سہی پیمانِ محکم

محبّت کو دعائیں دے رہا ہوں کہاں میں، اور کہاں یہ دولتِ غم

کوئی دیکھے ہماری سادگی کو بڑھاتے جا رہے ہیں ربطِ باہم

کبھی تم یاد آتے ہو، کبھی دل یاد آتا ہے ہر اک بچھڑا ہوا منزل بمنزل یاد آتا ہے

عشق اک کیف ہے، جس میں نہ مکاں ہے نہ زماں
کوئی آغاز نہیں تھا، کوئی انجام نہیں

محبّت کی حقیقت، اے حفیظ! اس کے سوا کیا ہے
بہت مشکل تھا جینا، اس کو آساں کر رہا ہوں میں

پوچھا کسی نے حال، تو رک رک کے تیرا نام
لب پر شالِ کوشش ناکام آگیا

دیکھا جو پریشاں حال مجھے، اس جانِ محبت نے یہ کہا
ہم نے بھی کیا ہے عشق، مگر ایسا تو ہمارا حال نہ تھا

شبِ فراق جو نیند آگئی، تو کیا ہوگا
کہ سیلِ نور مرے بام و در سے گزرا ہے

اکھیں بھی آگیا شاید یقیں ترکِ محبت کا
طبیعت ان سے مل کر اب پریشاں کیوں نہیں ہوتی!

میانِ عشق وہوس ہے مقامِ قلب ونظر
نہ عشق عین حقیقت، نہ ہے ہوس باطل

سنا رہا ہوں برنگِ غزل، زمانے کو
حکایتِ غمِ دوراں، فسانۂ غمِ دل

میں ہوں گناہگار، گناہوں کا ذکر کیا
کچھ جبر کے طفیل ہیں، کچھ اختیار کے

دیں سے دیں جنگ آزما ہے، کفر سے آزردہ کفر
میری مایوسی نزاعِ کفر و دیں تک ہی نہیں

دامنِ صحرا بھی ہے، اور دامنِ افلاک بھی
اب جنوں محدود جیب وآستیں تک ہی نہیں

غم کی چنگاری ازل سے آب و گِل میں تھی حفیظ!
سلسلہ اس کا نگاہِ اوّلیں تک ہی نہیں

میری حالت پہ نہ جا، یوں بھی ہوا کرتا ہے
پوچھنے والے! کوئی بات اگر ہو، تو کہو

جب کبھی ہم نے کیا عشق، پشیمان ہوئے
زندگی ہے، تو ابھی اور پشیماں ہونگے

خیالِ ترکِ محبت سے کانپ اٹھتا ہے
وہ دل جو تیری محبت میں کامراں بھی نہیں

قفس ہو یا ہو نشیمن، سکونِ قلب کہاں
سکونِ قلب وہاں بھی نہ تھا، یہاں بھی نہیں

ابھی ابھی وہ گئے ہیں، مگر یہ عالم ہے
بہت دنوں سے وہ جیسے نظر نہیں آئے

کہیں یہ ترکِ محبت کی ابتدا تو نہیں
وہ مجھ کو یاد کبھی اس قدر نہیں آئے

عقیدہ نہیں، ظرف کی بات ہے
وہی شے حلال، اور وہی شے حرام

غرض ہو کوئی اُس میں شامل، حفیظ!
تو مجھ پر ہے دردِ محبت حرام

کہیں اماں نہ ملی گوشۂ قفس کے سوا
وہ طائروں پہ سرِ شاخسار گزری ہے

خزاں نصیب یہ سمجھے کہ آگئی ہے بہار
حفیظؔ! جب بھی چمن سے بہار گزری ہے

دل کی دنیا اس قدر آباد ہے
جس قدر ویراں ہیں چشم و گوش و لب

اب ان کے حسن میں، حسنِ نظر بھی شامل ہے
کچھ اور میری نظر سے نکھر گیا کوئی

کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن تھی
ہزار بار اٹھا، سوئے در گیا کوئی

اٹھا پھر آج مرے دل میں اشک کا طوفاں
پھر ان کی راہ سے با چشمِ تر گیا کوئی

کوئی زمیں سے بھی پہنچائے آسماں کو پیام
پیام اہلِ زمیں کو تو آسماں سے ملے

جب خموشی پہ تکلم کا گماں ہوتا ہے
دل پہ وہ لمحۂ غم سخت گراں ہوتا ہے

دیکھا جاتا نہیں محرومیِ دل کا عالم
جب غمِ عشق نصیبِ دگراں ہوتا ہے

اب تو پہلی ہی ملاقات میں، ہر صورت پر
کسی دیکھی ہوئی صورت کا گماں ہوتا ہے

مجھ پہ گزری تھی نہ وہ، تجھ سے جدا ہونے پر
اتفاقاً ترے ملنے پر جو مجھ پر گزری

آج کچھ حال ہی ایسا تھا کہ لب تک آئی
ورنہ یہ بات مرے دل میں تو اکثر گزری

کیوں نہ مانوس ہو دل غم سے جدائی میں، حفیظؔ!
ان سے ملنے پہ بھی حالت وہی اکثر گزری

مجبور ہو کے پھر تری محفل میں جائیں گے
مایوس ہو کے جو تری محفل سے آئے ہیں

قرارِ دل کو نہ آسودگیِ نظر کے لیے
یہ آزمائشِ قلب و نظر بشر کے لیے!

نظر سے حدِ نظر تک، تمام تاریکی
یہ اہتمام ہے، اک وعدۂ سحر کے لیے

جانے، کیا بات ہونے والی ہے　　دل پریشاں ہے آپ سے مل کر

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا　　اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

کب ملتی ہے، یہ دولتِ بیدار کسی کو　　اور میں ہوں کہ رونا ہے اسی دیدہ وری کا

اب خانقہ و مدرسہ و میکدہ ہیں ایک　　اک سلسلہ ہے قافلۂ بیخبری کا

دل میں ہو فقط تم ہی، تو آنکھوں پہ نہ جاؤ　　آنکھوں کو تو ہے روگ پریشاں نظری کا

وہ مجھ پہ مہرباں تھے، ابھی کل کی بات ہے　　اور سوچیے، تو جیسے زمانے گزر گئے

دَیر و حرم کی منزلِ دشوار ہے، حفیظ!　　ہم ان کی جستجو کے بہانے گزر گئے

دعویِ ترکِ محبّت تو بڑی بات ہے، خیر　　بھول ہی جائیں تمھیں، ہم سے نہ اتنا کبھی ہوا

کبھی دشمن چلے اور ہاتھ میں خنجر لیے نکلے
کبھی احباب اٹھے، اور دشنہ زیرِ آستیں آئے

حفیظ! کون ہے تسکینِ خواب کا منکر　　یہ اور بات ہے، توفیقِ خواب ہی نہ رہے

بھول گئے ان کی ہر اک بات کو　　ہم سے یہ اک کام بڑا ہو گیا

ترکِ محبّت ہی سہی اب، حفیظ!　　فرضِ محبّت تو ادا ہو گیا

پھر آئیں، حفیظ! یا نہ آئیں　　جو کہنا ہو، آج ان سے کہہ لے

یہ خود فریبی کہ صبح ہو گی، تمیزِ لیل و نہار تک ہے
کہ انتہائے شبِ جدائی، طلوعِ شمعِ مزار تک ہے

یہ عشق وہ دردِ جانستاں ہے، کوئی نہیں رازدارِ حسن کا
کہ اس کی یورشِ غمِ نہاں سے تبسّم آشکار تک ہے

چراغِ مہر و وفا جلائیے، مگر وہی تیرگی کا پہرا
سوادِ دَیرِ بتاں سے لے کر حرم کے قرب و جوار تک ہے

بقدرِ توفیق بہرہ ور ہو، تصرّفِ دردِ آرزو سے
کہ ابتدا قدِ یار سے ہے، تو انتہا اَوجِ دار تک ہے

دور، اور قرب کا اتنا احساس　　کہ ابھی جیسے یہاں تھا کوئی

کہاں کا عشق کہ اب رسم و راہ بھی تو نہیں
جو روز تھی، وہ نظر گاہ گاہ بھی تو نہیں
عذابِ جاں ہی سہی عشق، لیکن اس کے بغیر
غمِ زمانہ سے کوئی پناہ بھی تو نہیں
جب ابتدائے محبت ہی بس کی بات نہ تھی
تو اہلِ عشق پہ لازم نباہ بھی تو نہیں

کتنی مشکل تیرے غم کی پاسداری ہو گئی
اشک آنکھوں میں ہیں، رُسوا وضعداری ہو گئی

درِ میکدہ باز تھا، باز ہے
کئی در کھلے، بند ہوتے گئے

بہت دور جلوہ نے دھوکہ دیا
مجھے قربِ جلوہ گہِ ناز ہے

یہ تنگ پیرہنی ہے دلیلِ گلبدنی
فشار سے ہیں وہ اک موجِ رنگ سر تا پا

دوست ملتا ہے بڑی مشکل سے
دوستی عام ہے لیکن اے دوست!

راستے نکلے کئی منزل سے
ہم کو منزل نے بھی گمراہ کیا

دفعتاً رک گئے آ کے اک نام تک
دیر تک اک فسانہ سناتے رہے

ہر عیش اذیت دیتا ہے، ہر درد میں لذت ہوتی ہے
اور اس کے سوا ہم کیا جانیں، کیا چیز محبت ہوتی ہے

نا آشنا رہے، ترے لطفِ نہاں سے ہم
جب تک ہوئے نہ تلخیِ ہجراں سے آشنا

دیکھو، تو آ رہے ہیں نظر بے زباں سے ہم
سمجھو، تو لب ہیں ساحلِ طوفانِ گفتگو

پرانے زخم اگر آسودۂ مرہم بھی ہوتے ہیں
ہزاروں زخم ابھر آتے ہیں اک حرفِ تسلی سے

ان کی آنکھوں میں زباں ہو جیسے
پرسشِ غم کا قرینہ مت پوچھ

بات دل میں کہاں سے آتی ہے؟
دل سے آتی ہے بات لب پہ، حفیظ!

خود ناشناس ہم ہیں، خدا ناشناس ہم
واماندۂ دیارِ بتاں، راندۂ حرم

ترے لطف و کرم ہیں، تو بھی ہے، تیری وفا بھی ہے
مگر کوئی مداوا، اس دلِ بیتاب کا بھی ہے؟

فرقت کاکوروی، غلام احمد

ان کا خاندان یوپی کے مشہور قصبۂ کاکوری کا رہنے والا تھا۔ فرقت نے اپنے مجموعۂ کلام "ناروا" میں اپنے جو مختصر حالات شامل کیے ہیں، ان میں مشہور نعت نگار مولوی محمد محسن کاکوروی (ف ۱۵ اپریل ۱۹۰۵ء) کو اپنا جدّ امجد لکھا ہے۔ ٹھیک رشتہ یہ ہے کہ محسن کاکوروی مرحوم، فرقت صاحب کی نانی (نادر النسا بیگم) کے سگے ماموں نا دبھائی تھے۔ اس سے ثابت ہے کہ ان کا خاندان عمائد خطہ میں سے تھا۔ فرقت کے والد شوکت علی بلحاظ پیشہ اوورسیر تھے۔ شوکت علی کی شادی جناب انیس احمد عباسی کی ہمشیر سے ہوئی تھی۔ ان کا نام احتشام النساء (عرف شہزادی) تھا؛ وہ بھی فرقت کی رحلت کے چند ماہ بعد رہگرائے عالم بقا ہوئیں۔

اگرچہ فرقت نے لکھا ہے کہ وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے لیکن شمیم کرہانی صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ وہ غالباً ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے کیونکہ ۱۹۷۲ء میں انھوں نے شمیم صاحب کو بتایا تھا کہ میں ۶۲ سال کا ہو چکا ہوں۔ سرکاری کاغذات میں تاریخِ ولادت میں اس طرح کی غلطی، بالخصوص عمر کم بتانا، عام ہے۔ میرے خیال میں بھی ۱۹۱۰ء کی تاریخ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ فرقت صاحب لکھنؤ (گولہ گنج اسپتال) میں ستوانسے پیدا ہوئے تھے، اسی لیے وہ عمر بھر قوام کے پتلے اور کمزور رہے۔ لیکن ان کا بچپن کاکوری میں گزرا۔

شوکت علی کے تین اولادیں ہوئیں: انتخاب فاطمہ، غلام احمد (فرقت)، احمد توفیق

علوی۔ بدقسمتی سے شوکت علی کا عین جوانی (غالباً ۱۹۱۶ء) میں انتقال ہوگیا۔ گھر میں کچھ اندوختہ تو تھا نہیں، خاندان کے لیے زندگی دشوار ہوگئی۔ ماموں شیخ صفدر علی صاحب (متوسّلِ دربارِ رامپور) آڑے آئے، انھوں نے پندرہ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا جس سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے میں کچھ مدد ملی۔ سستے کا زمانہ تھا تنگی ترشی سے بسر ہونے لگی۔ لیکن یہ قوتِ لایموت بچوں کی تعلیم کا بار اٹھانے سے قاصر تھی۔

فرقت بڑے بیٹے تھے، پہلے وہی تعلیم کی منزل کو پہنچے۔ بہت دن تک محلّے کے ایک مولوی صاحب سے اردو، فارسی پڑھتے رہے، جس میں خرچ برائے نام بھی نہیں تھا۔ پھر گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول، لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔ درمیان میں کوئی سال ایک کے لیے اپنے بڑے ماموں مولوی رئیس احمد عباسی کے پاس سلطانپور چلے گئے۔ عباسی صاحب وہاں عدالت میں منصرم اور اچھے صاحبِ حیثیت بزرگ تھے۔ فرقت پانچویں درجے میں تھے، جب وہ سلطانپور گئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی کا کیا علاج! اُس نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ابھی یہ ساتویں میں تھے کہ مولوی رئیس احمد بھی اللہ کو پیارے ہوگئے اور یوں وہ پھر ایک مرتبہ بے یار و مددگار رہ گئے، اور انھیں واپس لکھنؤ آنا پڑا۔ اس وقت عمر ۱۳-۱۴ برس کی ہوگی۔ یہاں ان کا قیام محلہ باورچی ٹولہ کے ایک مکان میں تھا۔ لیکن آفرین ہے ان کی ہمّت کو! انھوں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں دو مقبول روزنامے "ہمدم" اور "حقیقت" تھے۔ روزانہ علی الصّباح اسکول جانے سے پہلے گلی کوچوں میں پھر کر "حقیقت" کے سو سوا سو پرچے بیچ ڈالتے۔ اس سے روزانہ کم و بیش آٹھ دس آنے کی آمدنی ہو جاتی، جو بالکل ناکافی تھی، لیکن بالکل کچھ نہ ہونے سے کچھ بہتر ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے چھوٹے بچوں کو پڑھانے کا کام لینے کے لیے تگ و دَو شروع کی۔ قسمت یاور تھی کہ ان کی کم عمری کے باوجود کچھ کام مل گیا۔ اس سے تین روپیہ مہینا ملنے لگا، جو اور نہیں تو اسکول کی فیس کے لیے کافی تھا۔

اس کے بعد انھوں نے ۱۶-۱۷ برس کی عمر میں ایک دوست کی شراکت سے کچھ کاروبار

بھی کیا۔ دراصل یہ سب پاپڑ انھیں اپنی تعلیم اور خاندان کی کفالت کے لیے روپیہ پیدا کرنے کے واسطے بیلنا پڑے۔ بارے، کن مشکلوں سے ۱۹۳۱ء میں انٹر پاس کیا؛ اور اب یہ اُسی روزنامہ "حقیقت" کے نائب مدیر ہو گئے، جسے کسی زمانے میں آوازیں لگا لگا کر گلی کوچوں میں بیچا کرتے تھے۔ وہ اس میں خبروں کے علاوہ مزاحیہ کالم بھی "کفِ گلفروش" کے عنوان سے لکھا کرتے تھے۔

تعلیم ہنوز نامکمل تھی۔ انھوں نے غالباً ۱۹۳۶ء میں پرائیویٹ طور پر لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ مولوی انیس احمد عبّاسی (ایڈیٹر و مالک "حقیقت") نے جو ان کے حقیقی ماموں بھی ہوتے تھے، اسی زمانے میں ایک ہفت روزہ (انگریزی) "نیو کریسنٹ" جاری کیا تھا۔ انھوں نے فرقت کو اس کے عملے سے بھی منسلک کر لیا۔ لیکن یہ پرچہ دو سال بعد مالی مشکلات کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اب فرقت نے اپنا ذاتی اخبار "صداقت" (ہفتہ وار) کے نام سے نکالا۔ یہ کُشتم کُشتم دو سال چلا۔ اس پر فرقت صحافت سے مایوس ہو گئے۔ خیال کیا کہ کوئی اور ذریعۂ معاش تلاش کیا جائے۔ اس میں انھیں کہاں کہاں کے کنوئیں نہیں جھانکنا پڑے! درزی کا کام سیکھا اور کٹائی کے کام میں مہارت پیدا کر کے حکومت کے سلائی کے کارخانے (شاہجہانپور) میں بطور نگراں (سپروائزر) ملازم ہو گئے۔ لیکن فیکٹری کے گرد و نواح کے مخدوش حالات دیکھ کر طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور وہیں میونسپلٹی کے دفتر میں کلرکی کر لی۔ پھر وہاں سے لکھنؤ سکریٹریٹ میں منتقل ہو گئے۔ اسی قیامِ لکھنؤ کے دوران میں (۱۹۴۵ء) لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے (تاریخ) کی سند لی۔ ۱۹۴۷ء کے زمانے میں وہ یوپی حکومت میں فیلڈ پبلسٹی افسر کے دفتر میں غالباً کسی ضلع کے انچارج رہے۔

اب انھوں نے تعلیمی شعبے میں ملازمت حاصل کرنے کی ٹھانی اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ اوّل، اواخرِ ۱۹۴۷ء میں حلیم کالج، کانپور میں تاریخ پڑھانے پر مقرر

ہوئے۔ ایک سال بعد ۱۹۴۸ء کے آخر میں اینگلو عربک اسکول، دلّی میں آئے اور یہاں بھی تاریخ کے مدرّس ہی کا عہدہ ملا۔ یہیں سے انھوں نے دوبارہ ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کیا۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایڈ کی سند لی۔ وہ آخر تک اسی اسکول کی ملازمت میں رہے۔

جولائی ۱۹۴۱ء میں ان کے ماموں مولوی انیس احمد عباسی (ف نومبر ۱۹۷۵ء) نے اپنی صاحبزادی رئیس بانو (عرف سَرو) ان کے عقدِ نکاح میں دے دی۔ سات بچے موجود ہیں: طارق، توقیر، رافع، طیّب اور تاج، پانچ بیٹے اور رعنا اور صبوحی دو بیٹیاں۔ ان کے چھوٹے بھائی احمد توفیق علوی لاولد تھے، اس لیے بڑا بیٹا طارق انھیں دے دیا تھا۔ ابتدائی زمانے کی عُسرت اور روزانہ رات گئے تک کام کرنے اور جاگنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیند بہت کم ہو گئی تھی۔ بعض اوقات متواتر کئی کئی دن بن سوئے گزر جاتے تھے۔ اس سے صحت مستقل طور پر مخدوش ہو گئی۔ عین عنفوانِ شباب میں سل کا حملہ ہوا اور منہ سے خون آیا۔ بارے، اس سے جان تو بچ گئی، لیکن دمہ سدا کا ساتھی بن گیا۔ خوراک میں گوشت سے کاملاً اجتناب تھا، صرف سبزی ترکاری کھاتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، ہمیشہ دونوں وقت ٹھنڈے پانی سے نہاتے اور یہ روزانہ کا معمول تھا۔

وہ بدھ کے دن ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جھریا (بہار) گئے۔ جمعہ ۱۲ جنوری کو وہاں سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ شب دورانِ سفر میں طبیعت یکایک خراب ہو گئی۔ ہفتے کی صبح (۱۳ جنوری) کو جب گاڑی مغلسرائے پہنچی، تو ڈبّے میں ان کی لاش ملی۔ چونکہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ لاش کس کی ہے، پوسٹ مارٹم کے بعد اسے بنارس کی اسلامی انجمن کے سپرد کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے اسی شام نہلا دُھلا کر گنجِ شہیداں، اردلی بازار کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ بیوی بچوں میں سے کسی کو شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مار دیا دیارِ غیر میں مجھ کو، وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے، مری بیکسی کی شرم

فرقت کا شروع میں، اخباروں سے جو واسطہ پڑا، تو اس سے انھیں مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ جو ملتا، اسے چاٹ جاتے۔ آہستہ آہستہ خود لکھنے لگے۔ طبیعت میں چُلبلاپن تھا، اس لیے قدرتاً مزاح کی طرف مائل ہو گئے۔ "حقیقت" میں "کفِ گلفروش" مزاحیہ کالم ان کے حوالے ہو گیا، تو اس سے جہاں قلمرو وسیع ہو گئی، وہیں ذمہ داری کا احساس بھی بڑھ گیا۔ وہ ترقی پسند مصنّفین کی بیراہروی اور سطحیت کے مخالف تھے، ان کے خلاف ان کا جہاد آخر تک قائم رہا۔ ان لوگوں نے بھی فرقت کو منہ نہیں لگایا اور جتنی اہمیت انھیں ملنا چاہیے تھی، نہیں دی۔

فرقت کے مزاح کی جڑیں تو لازماً پنچ صحافت میں دیکھی جا سکتی ہیں، لیکن ان کے طنز نے لفظی قلابازیوں سے، جو پنچی اخباروں کا طرّۂ امتیاز تھا، آگے گزر کر اس میں گہرائی اور مقصدیت پیدا کر دی تھی۔

انھوں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا؛ اور اس میں آرزو لکھنوی (ف اپریل ۱۹۵۱ء) سے مشورہ کیا۔ استاد کے زیرِ اثر وہ ۱۹۳۶ء تک سنجیدہ شعر کہتے رہے۔ لیکن طبیعت کی جولانی نے اس کے بعد مزاح کے میدان میں پہنچا دیا۔

ان کی بعض مطبوعہ کتابوں کے نام یہ ہیں:

مداوا (۱۹۴۴ء)؛ نارروا (۱۹۴۶ء)؛ کفِ گلفروش (۱۹۵۵ء)؛ مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں؛ صید وہدف؛ شوخیِ تحریر؛ اردو ادب میں طنز و مزاح (۱۹۶۴ء)؛ مزاحیہ شرحِ دیوانِ غالب (۱۹۶۴ء)؛ غالب خستہ کے بغیر (۱۹۷۰ء)؛ قند مکرر (۱۹۷۱ء)؛ ایک آدھ کو چھوڑ کر یہ سب کتابیں لکھنؤ سے شائع ہوئیں۔

مندرجۂ ذیل چند شعر ان کی آخری بیاض سے لیے گئے ہیں اور ان میں سے غالباً بیشتر ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں:

نئی جیل، لمبی حوالات ہوگی ہر اک رات نغموں بھری رات ہوگی

جہنم میں جانے کی اتنی خوشی ہے کہ سب شاعروں سے ملاقات ہوگی

جب تھا زندہ، تو اڑا رکھا تھا مرحوم ہوئے
اب جو مرحوم ہوں، فرماتے ہیں حال اچھا ہے
اپنا کل قرض وہ یکمشت طلب کر بیٹھے
ان سے طنزاً جو کہا میں نے کہ حال اچھا ہے
اپنے عشاق سے سب لڑکیاں شادی کرلیں
یہ ترے باپ کی خواہش، یہ خیال اچھا ہے
ماں مریں، باپ مرے، شیخ الکشن ہارے
اک برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

شیخ جی اس لیے فوٹو نہیں کھنچواتے ہیں تاکہ حوریں کہیں پہلے سے انھیں دیکھ نہ لیں
اور جب مر کے بصد شوق یہ جنت پہنچیں تو وہ اندر سے کواڑے نہ مقفّل کردیں

جلنے شاعر ہیں وہ عشاقِ صنم ہوتے ہیں شعر کہہ کر غمِ معشوق میں سب روتے ہیں
لیکن اک بات یہ اب تک نہ سمجھ میں آئی گھر میں کیوں جاکے یہ بیوی کے قدم دھوتے ہیں

حسن اور عشق کی مل جل کے بسر ہو کیسے!
وصل آساں ہے بہرحال، مگر ہو کیسے!
قحط شکّر کا ہے، محبوب بھی کہتے ہیں بجا
ایسی حالت میں کوئی شیر و شکر ہو کیسے!

شیخ جی گھس گئے جنّت میں نہ جانے کیسے
اور پھر واں سے نکالے گئے جیسے تیسے
پوچھا لوگوں نے: حضرت، آپ پلٹ کیوں آئے
بولے: واں بھی ہیں یونہیں لوگ کچھ ایسے ویسے

عشق کو مختصر کیا، آج کے نوجوان نے صبح سے عاشقی چلی، شب کو تمام ہوگئی
آپ سے سب کو پیار تھا، آپ سے رسم و راہ تھی آپ کا عقد ہوگیا، بات تمام ہوگئی

چپکے سے وہ تو چل دیے عشق کے "بیک ڈور" سے — عشق کی انتظار میں عمر تمام ہو گئی

آپ مجھے بُرا کہیں، باپ مگر نہ کچھ کہیں
آپ کی بات اور ہے، باپ کی بات اور ہے
لاتوں کا ہے معاملہ، زندگی اور موت کا
ایک کی لات کھا چکے، ایک کی لات اور ہے
آنکھ سے آنکھ لڑ گئی، کونسی پھر کسر رہی
نصف نکاح ہو چکا، نصف کی بات اور ہے
اس لیے حسن و عشق میں روزِ ازل سے بیر ہے
دونوں کے باپ لاپتہ، دونوں کی ذات اور ہے
عشق کے دم پہ بن گئی، حُسن نے "وارننگ" جو دی
آج کی چھوٹ اور ہے، آج کی رات اور ہے
عشق کے درد کی دوا، ایک فقط نکاح ہے
وہ ہے "فراڈ" جو کہے، راہِ نجات اور ہے

اُدھار

ہم کو ملازمت جو کھڑے گھاٹ مل گئی — یا نجوں کی ناؤ کانوں کے ساحل سے جا لگی

چھٹی پھر ان کو ہم نے بصد شوق یوں لکھی — "آیا کرو ادھر بھی، مری جاں کبھی کبھی"

قرضے سے، ہائے تم تو پریشان ہو گئے
لو خوش ہو، لین دین کے سامان ہو گئے

دل نے کہا کہ جھوم کے نعرے لگائیے — تختی لگا کے بیٹھ پہ اب گھوم جائیے

بیوی کو ایک خط میں یہ لکھ کر بلائیے — میکے کو چھوڑ چھاڑ کے اب جلد آئیے

آجائیے، تو مل کے مہاجن کو لوٹ لیں
قرضہ وہ لیں کہ اصل کبھی دیں نہ سود دیں

وہ قرض پھر لیے ہیں کہ اللہ کی پناہ! — رو پلے اسی سے لے مرے، جس پر پڑی نگاہ

پھر اُن کے بھاگنے کی ہی چھوڑی نہ کوئی راہ   سب کے لنگوٹی بندھ گئی، حالت ہوئی تباہ

یارا نہ تھا فغاں کا، نہ موقع تھا آہ کا

بُتّا پھٹا ہوا تھا، ہر اک قرضخواہ کا

قرضے پہ ہم نے ایک مکان ایسا لے لیا   جس میں کہ دو طرف سے تھا جانے کا راستا

جب سارے قرضخواہوں کو اس کا پتہ چلا   ہر فرد لے کے اپنا بہی کھاتا آگیا

تھا اک طرف سے شور کہ تشریف لائیے

سنّاٹا کہہ رہا تھا کہ ڈنڈے بجائیے

پہلی جو آئی، ایک قیامت مچا گئی   بِل لے کے قرضخواہوں کی اِک فوج آگئی

یوں عاقبت کا راستا ہم کو دکھا گئی   دل نے کہا کہ اٹھیے، حضرت! موت آگئی

ہر قرضخواہ حدِّ ادب ناگھنے لگا

دل اپنی مغفرت کی دعا مانگنے لگا

ہر سمت لاؤ لاؤ کے گرنے لگے جو بم   گرمایا دل، تو آیا طبیعت میں پیچ و خم

بنیا بغل سے بولا کہ دلوائیے رقم   کہنے لگا مغلیہ کہ کب سے کھڑے ہیں ہم

رہ رہ کے اپنی بوٹیاں ہم نوچنے لگے

اور خودکشی کی راہ نئی سوچنے لگے

پُر کیف زندگی ہے فقط قرضخواہ کی   دنیا میں اس سے بڑھ کے سعادت کسے ملی

کچھ بدنصیب کرتے ہیں ان پر تھُڑی تھُڑی   کیا جانیں وہ کہ چیز ہے کیا نادہندگی

کنگن بھی ہے جڑاؤ، یہی ہتھکڑی بھی ہے

گو بس میں روپیا ہے، مگر بے بسی بھی ہے

ہے قرض کی یہ شان کہ لو اور کبھی نہ دو   دس بیس ہاتھ کھاؤ، تو دو چار خود دھرو

مرنے پہ، قرضخواہوں کے چندے سے یوں اٹھو   دھیلا نہ اپنا خرچ ہو، اس ٹھاٹھ سے مرو

لے کر رقم جو دوگے، تو بخشے نہ جاؤ گے

کس کس کا قرض حشر میں جاکر چکاؤ گے

چھ سات سال قرض کے پیسے نہ جب دیئے
دس بیس سُود خور تو یونہی ڈھلک لیے
جو اُدھ مُوئے تھے، وہ بھی تھے کچھ ایسے کج دلے
بیصبر ہو کے بولے، حضرت! ہم تو اب چلے

وہ ہم نے قرضخواہوں کی مٹی پلید کی
وہ خود تو مر گئے، پہ رقم ان کی رہ گئی

تضمین

ہاتھ پیر اور جسم اچھا چاہیے
ڈھیر سا پھر اس پہ پیسا چاہیے
"چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے"

منھ چھپانے میں ہے کیا فرزانگی
آئیے ہم بھی تو دیکھیں بانگی
"دوستی کا پردہ، ہے بیگانگی
منھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے"

پوچھو بکرے سے کہ کیا ہے بقر عید
چھوٹتے، جل کر کہیگا، چل یزید!
"منحصر مرنے پہ ہو، جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے"

ہم تمھیں اس وقت غالب مانتے
جب کسی گبھرو جواں کو گانٹھتے
"غافل! ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے"

ہے بڑھاپے میں ہوس کی کوئی حد
جب کہ گھر والی کیسے بیٹھی ہو زد
"چاہتے ہو خوبرویوں کو، اسد!
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے"

محمد اکرام، شیخ

ان کا آبائی وطن وزیرآباد (ضلع گوجرانوالہ، پاکستان) تھا جہاں ان کا خاندان ممتاز تھا۔ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے۔ لیکن اکرام صاحب کی پیدائش ۱۰ ستمبر ۱۹۰۸ء کو چھوٹے سے قصبے چک جھمرہ (ضلع لائل پور، پاکستان) میں ہوئی جہاں اس زمانے میں ان کے والد اپنے کاروبار کے سلسلے میں مقیم تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم مشن ہائی اسکول، وزیرآباد میں پائی، اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں ایم، اے کی سند لی۔ اسی سال انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحان بیٹھے اور کامیاب ہو گئے۔ انگلستان میں انھوں نے ٹریننگ کے زمانے میں جیزس کالج، آکسفرڈ میں تعلیم پائی۔ اس زمانے میں انھوں نے جرمن کا بطور ثانوی زبان کے انتخاب کیا اور اس میں بھی مہارت حاصل کر لی۔

وہ ۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو حکومتِ ہند کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ان کا تقرر بمبئی کے صوبے میں ہوا تھا۔ ۱۹۴۶ء تک وہ کیرا اور سورت اور پونا میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ضمناً یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انھیں مراٹھی زبان میں بھی اعلیٰ استعداد حاصل تھی۔ ۱۹۴۶ء کے نصف آخر میں وہ مرکزی حکومت کی وزارتِ اطلاعات و نشریات میں ڈپٹی سکتر مقرر ہو کر دلی آ گئے۔ وہ اسی عہدے پر تھے جب ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد اور تقسیم ہوا ہے۔ اس پر وہ پاکستان منتقل ہو گئے۔

پاکستان میں بھی وہ زیادہ تر وزارتِ اطلاعات و نشریات ہی سے وابستہ رہے۔

بالآخر ۱۹۶۶ء میں وہ یہاں سے سکرٹری کے عہدے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کچھ مدت کے لیے بورڈ آف ریونیو کے رکن اور ایک سرکاری ادارے کے صدر بھی رہے تھے۔ سرکاری ملازمت سے الگ ہونے کے بعد وہ اپنی وفات تک ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔

آخری دو ایک برس میں انھیں اختلاجِ قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اسی کے علاج کے لیے میو اسپتال، لاہور میں داخل ہوئے تھے، جہاں بدھ ۱ جنوری ۱۹۷۳ء کی شب میں راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ جنازہ جمعرات کی سہ پہر میں اٹھا۔ لاہور کے مشہور قبرستان "میانی صاحب" میں سپردِ خاک ہو گئے۔ وسیع حلقۂ احباب کے علاوہ اپنے پیچھے تین لڑکے اور ایک لڑکی سوگواروں میں چھوڑے۔

ملازمت اور حکومت میں اعلیٰ عہدے اپنی جگہ، لیکن دراصل ان کا مزاج علمی اور تحقیقی تھا۔ مطالعے اور علم و ادب کا شوق ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ گورنمنٹ کالج کی طالبعلمی کے زمانے میں وہ کالج کے ماہانہ رسالے "راوی" کے بہرۂ اردو کے مدیر رہے۔ اسی زمانے میں ان کے کچھ مضامین ہمعصر پرچوں میں بھی شائع ہوئے۔

وہ پونا میں تھے، جب انھوں نے ۱۹۳۶ء میں "غالب نالہ" کے نام سے غالب کی سوانحعمری شائع کی۔ میرزا کی سیرت کے بارے میں یہ پہلی علمی کوشش تھی۔ اس کے ساتھ انھوں نے میرزا کے اردو اور فارسی کلام کو بھی تاریخی ترتیب سے جمع کرنے کی کوشش کی، اور اسے "ارمغانِ غالب" کے نام سے الگ شائع کیا۔ دونوں کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ بعد کو سوانح اور نقدِ کلام کی الگ الگ جلدیں "حیاتِ غالب" اور "حکیم فرزانہ" کے نام سے چھپیں۔ پھر اسی انداز پر مولانا شبلی نعمانی کی سوانح حیات "شبلی نامہ" لکھی، جو بعد کو معتدبہ اضافوں کے ساتھ "یادگارِ شبلی" کے عنوان سے دوبارہ شائع ہوئی۔ انھوں نے مسلمانانِ ہند کی تمدنی اور ثقافتی، علمی اور مذہبی تاریخ ان کے علماء اور مفکروں کے سوانح اور سیرت

کے آئینے میں تین مجلدات میں مرتب کی (آبِ کوثر؛ رودِ کوثر، موجِ کوثر) ایک ضخیم جلد میں "پاک و ہند میں مسلمانوں کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ" انگریزی میں شائع کی تھی جس کا انگریزی خلاصہ بعد کو پروفیسر ائنسلی، ٹی، ایمری نے "ہندستان میں مسلم ثقافت" کے نام سے امریکا سے شائع کیا تھا۔ انھوں نے اے، آر، البیرونی کے فرضی نام سے ایک اور انگریزی کتاب MAKERS OF PAKISTAN (پاکستان کے معمار) کے نام سے بھی لکھی تھی۔ بعد کو یہی کتاب خاصے ردّ و بدل کے ساتھ MODERN MUSLIM INDIA & BIRTH OF PAKISTAN کے نام سے شائع ہوئی۔ اس موضوع پر یہ غالباً بہترین کتاب ہے۔

۱۹۴۹ء میں (یا شاید ۱۹۵۰ء) میں شہنشاہِ ایران، پاکستان کے دورے پر تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر ان کی خدمت میں پیش کرنے کو اکرام صاحب نے ہندستان/پاکستان کے فارسی شعرا کا انتخاب مرتب کیا تھا، جو کتابت و طباعت کے خاص اہتمام سے "ارمغانِ پاک" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان کی کچھ اور تصنیفات بھی ہیں، جن میں سے بعض پر ان کا نام موجود نہیں ہے۔

ممتاز شیریں

ان کا آبائی وطن بنگلور تھا، لیکن وہ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۴ء کو میسور میں پیدا ہوئیں۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں مہارانی ہائی اسکول، میسور میں پائی اور اس کے بعد مہارانی کالج، بنگلور ہی میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے ۱۹۴۲ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ شروع سے سنجیدہ مزاج تھیں؛ چنانچہ بی اے میں ان کے مضامین: عمرانیات (سوشیالوجی)، نفسیات (سائیکلوجی)، معاشیات (اکنامس)، تاریخ اور فارسی تھے۔ طالبعلم کی حیثیت سے وہ غیر معمولی طور پر کامیاب رہیں، نہ صرف ہمیشہ ہر درجے میں اوّل آئیں، بلکہ انفرادی طور پر بھی ہر ایک مضمون میں سرِ فہرست رہیں۔ جب تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان گئیں، تو وہاں کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کی سند لی۔ یورپ جانے کا موقع ملا، تو چند روز آکسفرڈ یونیورسٹی میں جدید انگریزی تنقید کے اسباق میں بھی حصّہ لیا تھا، لیکن وہاں سے غالبًا کوئی سند حاصل نہیں کی۔ وہ آکسفرڈ میں دو برس رہ کر ڈاکٹر آف فلاسفی (ڈی فل) کی ڈگری لینا چاہتی تھیں، لیکن مالی عدمِ استطاعت نے اس کا موقع نہ دیا اور وہ واپس وطن چلی آئیں۔

۱۹۴۲ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد ہی ان کی صمد شاہین سے شادی ہوگئی تھی۔ یہ رشتے میں ان کے عزیز بھی تھے؛ انھوں نے اسی زمانے وکالت کی سند لی تھی۔ اس شادی کا نتیجہ دو بچے ہیں: پرویز اور گلریز۔

صمد شاہین نے بعد کو ڈاکٹریٹ کرلی اور سرکاری ملازمت میں شامل ہو گئے۔

اس سلسلے میں انھیں بیرونِ ملک کئی جگہ قیام کرنا پڑا۔ پہلے مغربی یورپ میں تقرری ہوئی، بعد کو سیٹو کے صدر دفتر، بنکاک (تائی لینڈ) میں پہنچ گئے۔ صمد شاہین بتدریج بیورو آف ریفرنس اینڈ ریسرچ میں جائنٹ ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۵۴ء میں ہالینڈ کے دارالخلافہ ہیگ میں ایک بین الاقوامی ادبی کانگریس منعقد ہوئی تھی؛ ممتاز شیریں نے اس میں اپنے ملک کی نمایندگی کی تھی۔ وہ جہاں بھی گئیں، انھوں نے وہاں کے ادیبوں سے تبادلۂ خیالات کیا اور اس سے ان کے فکر وفن کو بہت فائدہ پہنچا۔ زندگی کے آخری ایّام میں وہ پاکستان کی وزارتِ تعلیم سے بحیثیت مشیر منسلک ہوگئی تھیں۔

ممتاز شیریں کو ۱۹۷۲ء کے اواخر میں انتڑیوں کے سرطان کا عارضہ لاحق ہوگیا؛ اور یہ نامراد مرض اتنی تیزی سے پھیلا کہ بروقت پورے طور پر علاج کا بھی انتظام نہ ہوسکا۔ فروری میں انھیں علاج کے لیے اسلام آباد کے پولی کلینک (اسپتال) میں داخل کیا گیا۔ وہیں چند ہفتے بعد ۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو دن کے دو بجے (بعمر ۴۸ سال) انتقال ہوا۔ اسی شام تدفین عمل میں آئی۔

انھوں نے کالج کے زمانے ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ "انگڑائی" ۱۹۴۲ء میں چھپا، تو لوگوں نے محسوس کیا کہ اردو کے افسانوی افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے "دیپک راگ" اور "میگھ ملھار"، جیسے طویل افسانوں سے جہاں اردو میں نئے تجربے کیے، وہیں ایک نئی روایت کی بنیا د رکھی۔ پھر انھوں نے ۱۹۴۴ء میں اپنے شوہر صمد شاہین کی معیت میں بنگلور سے "نیا دور" (ماہانہ) جاری کیا اور اس میں ان کے تنقیدی مضامین بھی چھپنے لگے، تو معلوم ہوا کہ وہ جتنی اچھی افسانہ نگار ہیں، اتنی ہی اچھی نقاد بھی ہیں۔ یہ پرچہ تقسیمِ ملک تک برابر شائع ہوتا رہا۔ اور جب وہ کراچی منتقل ہوگئیں، تو وہاں سے شائع ہونے لگا۔ یہ ۱۹۵۲ء میں بند ہوا، جب صمد شاہین بسلسلۂ ملازمت یورپ گئے۔

ان کے افسانوں کے دو مجموعے۔ اپنی نگریا (۱۹۵۵) اور حدیث دیگراں (۱۹۶۳) ۔ شائع شدہ موجود ہیں۔ امریکی (انگریزی) مصنف اسٹین بک کے ناول "دی پرل" کا ترجمہ "درِ شہوار" کے عنوان سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے امریکی افسانوں کا ایک مجموعہ بھی اردو میں مرتّب کیا تھا۔ اپنے تنقیدی مضامین بھی "معیار" کے عنوان سے جمع کیے تھے۔ منٹو ان کا محبوب افسانہ نگار تھا۔ انھوں نے اس کے بارے میں ایک کتاب ("نوری نہ ناری") بھی لکھی تھی، جس میں منٹو کے افسانوں میں انسان کے تصور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ آخری دونوں کتابیں غالباً آج تک شائع نہیں ہوئیں۔

ان کی وفات سے اردو نے ایسا مصنّف کھویا، جسے مشرق اور مغرب کے افسانوی فن پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی اور جس نے اردو افسانے کو منزلوں آگے بڑھایا۔

شوکت سبزواری، سیّد شوکت علی

ان کے جدِّ اعلیٰ مغلیہ عہد میں ایران کے شہر سبزوار سے (جو مشہد اور نیشاپور سے مغرب میں ہے) نقلِ مکان کر کے ہندستان آئے، اور یہاں ضلع بلند شہر (یوپی) کے قریب ایک پرانی بستی مرزا پور* میں بس گئے۔ ۱۸۵۷ء میں اس علاقے کا امن و امان تہس نہس ہو گیا، تو سیّد شوکت علی کے دادا سیّد نیاز علی اور ان کے چھوٹے بھائی سیّد افضل علی کو اپنا وطنِ ثانی بھی ترک کرنا پڑا۔ سیّد نیاز علی کے دوسرے بھائی سیّد فضل علی اسی ہنگامے میں انگریز کی گولی کا نشانہ بنے تھے۔ اس قافلے نے پہلے چندے بلند شہر میں قیام کیا، اور بالآخر میرٹھ میں رختِ سفر کھول دیا۔

شوکت علی کے والد کا نام سیّد اسد علی تھا۔ گھر کی مالی حالت کمزور تھی۔ وہ کچہری میں کسی وکیل کے ہاں محرّر تھے، اور اسی لیے عوام میں 'منشی اسد علی' کے نام سے مشہور تھے۔ اولاد میں ان کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں، جن کے نام بہ ترتیبِ تاریخِ ولادت یہ ہیں: حشمت علی، عزیز فاطمہ، یوسف علی، اسلام فاطمہ، شوکت علی، بلقیس فاطمہ، کلثوم فاطمہ، صالحہ خاتون۔ گویا شوکت علی بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے ان کی تاریخِ ولادت ۱۹۰۸ء لکھی ہے، لیکن قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرٹھ میں ۱۹۰۵/۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ سیّد اسد علی نے خاصی طویل عمر پائی۔ وہ تقسیمِ ملک کے بعد تک زندہ رہے؛ ۲۹

* یہ ضلع مرزا پور سے مختلف جگہ ہے۔

۱۹۵۲ء کو میرٹھ میں رحلت کی۔

اگرچہ زمانے کی روش کے مطابق خاندان میں اردو اور فارسی کا رواج تھا، اور ماحول بھی دینی تھا، لیکن گھر میں کوئی علمی یا ادبی روایت نہیں تھی۔ پیشے کے لحاظ سے یہ لوگ ملازمت اور سپہگری کو ترجیح دیتے تھے۔ لہذا جب سنِ شعور کو پہنچے، اور ان کی تعلیم کی منزل آئی، تو سید اسد علی نے بڑے بیٹے حشمت علی کو لے، دی ہائی اسکول، میرٹھ صدر میں، اور پھر دوسرے یوسف علی کو بھی گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ شہر میں انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کو بھیج دیا۔ بدقسمتی سے حشمت علی کا تعلیمی دور بہت مایوس کن ثابت ہوا۔ وہ پانچ چھ برس دسویں درجے کے امتحان میں بیٹھتے رہے، لیکن پوری کوشش کے باوجود ۲۱ برس کی عمر تک پاس نہ ہو سکے۔ بات یہ تھی کہ اگرچہ اور تمام مضامین میں ان کی قابلیت اپنے ساتھیوں سے کہیں زیادہ تھی، لیکن ریاضی میں وہ صفر تھے۔ اس مضمون سے انھیں مطلقاً مَس نہ تھا اور اسی میں وہ بار بار فیل ہوتے رہے۔ شومیِ قسمت وہ انھیں دنوں عین عالمِ شباب میں رحلت کر گئے۔ کڑیل جوان بیٹے کی اچانک موت، سیّد اسد علی پر تو گویا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بچارے اس صدمے سے مختل الحواس سے ہو گئے۔ ایسے حالات میں انسان اکثر توہمات کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ انھوں نے خیال کیا کہ ہو، نہ ہو، یہ مجھے بچوں کو انگریزی تعلیم دلوانے کی سزا ملی ہے۔ اس پر انھوں نے منجھلے بیٹے یوسف علی کو انگریزی اسکول سے اٹھا لیا[۵]۔

اس حادثے کا شوکت علی کی تعلیم پر بھی اثر پڑا، جو بڑے بھائی کی وفات کے وقت صرف آٹھ برس کے تھے۔ وہ خاصی بڑی عمر تک پڑھنے لکھنے سے محروم

---

۵ سیّد یوسف علی بفضلہٖ زندہ و سلامت میرٹھ میں موجود ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۵۔۷۶ برس کی ہے (ولادت: ۱۸۹۹/۱۹۰۰ء)۔ پیرانہ سالی کا معمولی سا اثر زبان پر ہے۔ خفیف سی لکنت سے قطع نظر، صحت عام طور پر اچھی ہے۔

رہے۔ بالآخر انھیں قرآن پڑھنے کے لیے ایک استانی کے حوالے کر دیا گیا۔ انھیں اردو پڑھنے کا بھی شوق تھا، لیکن اس کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔ اتفاق سے بہشتی زیور کا پہلا حصّہ کہیں سے ان کے ہاتھ لگ گیا۔ انھوں نے اپنی استانی سے درخواست کی کہ یہ مجھے پڑھا دیجیے، اور اردو لکھنا بھی سکھا دیجیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں تمھیں یہ کتاب تو پڑھا دونگی، لیکن لکھنا نہیں سکھاؤنگی۔ ان کے وجہ دریافت کرنے پر کھلا کہ استانی نے اپنے مرحوم خاوند کی ہدایت کے تحت ان کی زندگی ہی میں لکھنے سے اجتناب کرنے کی قسم کھائی تھی۔ غرض کتاب استانی نے پڑھا دی اور اٹکل سے انھوں نے دیکھ دیکھ کر حرف شناسی کے بعد اردو لکھنا خود سیکھ لیا۔ اس طرح انھوں نے قرآن ناظرہ ختم کر لیا، اور اردو میں بھی کچھ شُدبُد ہو گئی۔ اب والد نے ان کی آیندہ تعلیم کے بارے میں مسجد کے امام صاحب سے مشورہ کیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ تم نے دونوں بڑے لڑکوں کو انگریزی پڑھائی تھی؛ اب بطورِ کفّارہ اس لڑکے کو عربی پڑھواؤ، اس سے تمھاری سات پشتیں بخشی جائینگی۔ اس پر شوکت علی میرٹھ کے مدرسۂ امداد العلوم میں عربی فارسی کی تحصیل کے لیے بھیج دیے گئے۔

مدرسۂ امداد العلوم، دار العلوم دیوبند کی طرز کا مدرسہ آج بھی میرٹھ میں موجود ہے۔ اس زمانے میں اس کے صدر مدرّس مولانا عبد المومن دیوبندی مرحوم تھے۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن (ف نومبر ۱۹۲۰ء) کے سالے تھے؛ حدیث اور فقہ میں ان کی دور دور شہرت تھی۔ دوسرے اساتذہ میں مولانا اختر شاہ عربی ادب اور فارسی ادب میں ممتاز تھے؛ وہ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ منطق اور فلسفہ کے استاد مولانا عبد الرحمٰن تھے۔ ان فاضل اساتذہ کی موجودگی کے باعث اس زمانے میں اس مدرسے کو بہت بلند مقام حاصل تھا۔

شوکت علی نے ان سب استادوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کا فارسی اور عربی کا ذوق بہت حد تک مولانا اختر شاہ کی صحبت کا رہین

منت تھا۔ اسی مدرسے سے انھوں نے ۱۹۲۴ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۲۷ء میں منشی فاضل کے امتحان پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے پاس کیے، جو اس زمانے میں ان علوم کا مرکز تھا۔ منشی فاضل کے امتحان میں وہ اس سال کے جملہ طلبہ میں اوّل آئے تھے۔

والد کی خواہش کا احترام اپنی جگہ، لیکن ان سے چوری چھپے، انھوں نے انگریزی پڑھنے کا انتظام بھی کر رکھا تھا؛ اور یوں ۱۹۲۶ء میں انھوں نے انگریزی کے دسویں درجے کی سند بھی امتیازی نمبروں سے حاصل کر لی۔

یہاں غالباً ایک واقعے کا ذکر بے محل نہیں ہوگا:

شوکت صاحب نے مولوی فاضل کا امتحان دو مرتبہ پاس کیا۔ پہلی مرتبہ تو جیسا کہ اوپر لکھا، یہی ۱۹۲۴ء میں، دوسری مرتبہ اس سے دو تین برس بعد۔ ہوا یہ کہ مولوی عارف اللہ بیش امام مسجد جامع کے رشتے کے چچا حافظ احمد میاں، مولوی فاضل کا امتحان دینا چاہتے تھے۔ لیکن امتحان کی کافی تیاری نہیں تھی، یا کیا بات، وہ امتحان میں بیٹھنے سے گھبرا رہے تھے۔ شوکت صاحب نے ان سے کہا: آپ فکر نہ کریں، آپ کی جگہ میں امتحان میں بیٹھتا ہوں۔ چنانچہ وہ احمد میاں کی جگہ امتحان میں شریک ہو گئے۔ لیکن کسی طرح بھانڈا پھوٹ گیا؛ مہتممِ امتحانات کو شبہہ ہو گیا۔ تحقیق ہوئی اور یہ جعلسازی میں ماخوذ ہو گئے۔ مقدمہ چلا، اور سزا ہوئی، اور ان کی مولوی فاضل کی سند ضبط کر لی گئی۔ اس لیے انھیں دوبارہ امتحان پاس کرکے یہ سند حاصل کرنا پڑی۔

منشی فاضل کا امتحان پاس کر لینے کے بعد انھیں مدرسۂ عالیہ، میرٹھ میں ۳۰ روپے مشاہرے پر فارسی اور اردو کے مدرّس کی جگہ مل گئی تھی۔ یہاں ان دونوں زبانوں کے علاوہ اس زمانے میں قرآن کی کچھ ابتدائی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ وہ اس مدرسے میں ۱۹۳۰ء میں گئے تھے اور ۱۹۴۱ء تک یہیں رہے۔ اس دوران میں انھوں نے پرائیویٹ طور پر انٹر سے لے کر ایم اے (فارسی) تک کے امتحان

پاس کیے۔ ایم اے (فارسی) کا امتحان انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۷ء میں دیا، اور وہ اس سال کے کامیاب طلبہ میں اوّل آئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے (عربی) کیا (۱۹۳۹ء)۔ ۱۹۴۱ء میں انھوں نے مدرسۂ عالیہ کی ملازمت کے دوران ہی میں میرٹھ کالج میں داخلہ لے لیا اور دو سال بعد یہاں سے قانون کی سند (ایل ایل بی) حاصل کی۔ اس دوران (یعنی ۱۹۴۲ء) میں وہ آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) سالِ اوّل کا امتحان پاس کرچکے تھے۔

جولائی ۱۹۴۳ء میں وہ اسلامیہ انٹر کالج، بریلی کے شعبۂ فارسی وار دو سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں وہ ۱۹۴۶ء تک رہے۔ اسی اثنا میں انھوں نے ایم اے (اردو) کے سالِ دوم کا امتحان دے کر سند حاصل کی۔ اس کالج میں تین برس تک کام کے بعد وہ میرٹھ کالج کے شعبۂ اردو و فارسی میں آ گئے۔ میرٹھ آنے کا قصہ بھی دلچسپ اور قابلِ ذکر ہے۔

قیامِ بریلی کے زمانے میں انھوں نے "غالب کا فلسفہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کیا۔ مضمون ان کے اندازے سے طویل ہو گیا۔ وہاں کے ایک ناشر خلیل الرحمٰن مالک قومی کتبخانہ، بریلی ان کے ملنے والے تھے۔ ایک دن وہ حسبِ معمول آئے، تو یہ بیٹھے مضمون لکھ رہے تھے۔ انھوں نے دریافت کیا: کیا لکھا جا رہا ہے؟ تو کہا کہ غالب پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں، لیکن ختم ہونے میں نہیں آتا پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس پر خلیل الرحمٰن بولے: پھیلتا ہے، تو پھیلنے دیجیے، اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے! یہ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ اور سردی بڑے کڑا کے کی پڑ رہی تھی۔ اب خلیل الرحمٰن نے یہ معمول بنا لیا کہ ہر دوسرے تیسرے آتے اور شوکت صاحب کے کھانے کو درجنوں انڈوں کا ڈھیر سارا حلوا ساتھ لاتے۔ شوکت صاحب نے گویا یہ حلوا کھا کھا کر مضمون مکمّل کیا، جو بڑھ کر کتاب بن گیا؛ اور اسے خلیل الرحمٰن نے "فلسفۂ کلامِ غالب" کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا۔ یہ شوکت صاحب

کی پہلی کتاب تھی۔

شوکت صاحب نے یہ کتاب میرٹھ کے ایک متمول رئیس سیٹھ گوپی ناتھ کے نام معنون کی تھی۔ اس میں بھی مطلب سعدی دیگر تھا۔ سیٹھ صاحب موصوف کانگریس کے سر برآوردہ لیڈر اور میرٹھ کالج کی مجلسِ منتظمہ کے بااثر رکن تھے۔ اس کے بعد انھوں نے شوکت صاحب کو میرٹھ کالج میں ملازمت دلوادی۔ یہاں وہ ۱۹۵۰ء تک رہے۔

اسلامیہ کالج، بریلی کی ملازمت کے زمانے میں ان کی وجاہت حسین عندلیب شادانی (ف جولائی ۱۹۶۹ء) سے خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ عندلیب شادانی ۱۹۲۸ء سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کے پروفیسر تھے۔ شوکت سبزواری ہمیشہ قوم پرست رہے تھے اور سیاست میں ان کا میلان کانگریس کی حکمتِ عملی کے موافق تھا۔ اسی لیے وہ آزادی اور تقسیمِ ملک کے بعد ہندستان ہی میں مقیم رہے؛ اور درحقیقت ان کا ہجرت کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں شادانی نے انھیں ڈھاکے آنے کی دعوت دی۔ اِدھر تقسیم کے بعد کے زمانے میں یہاں اردو کے خلاف سرکاری اور غیر سرکاری رویّہ بھی ہمدردانہ نہیں رہا تھا۔ اس سے شوکت مرحوم کو یہ خیال ہوا کہ دیر سویر میری نوکری جاتی رہیگی۔ اس اندیشے نے انھیں شادانی مرحوم کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کیا، اور وہ ڈھاکے چلے گئے۔ وہاں وہ صدرِ شعبۂ اردو مقرّر ہو گئے۔ یہیں سے انھوں نے ۱۹۵۲ء میں اردو لسانیات میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ، ڈی) کی ڈگری لی، جس کی تیاری وہ قیامِ میرٹھ کے زمانے سے کر رہے تھے۔ لسانیات کی طرف ان کا میلان بھی ایک حسنِ اتفاق کا کرشمہ تھا۔

ملک کی تقسیم اور آزادی کے قبل تک یہاں مذہبی مناظروں کا عام رواج تھا۔ ہندو، مسلمان، عیسائی ایک دوسرے کے خلاف بھی مناظرے اور شاستر ارتھ کرتے رہتے، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اندرونی فرقوں میں بھی آئے

دن یہ مذہبی دنگل ہوتے رہتے تھے۔ اس کے لیے لوگ بڑی بڑی تیاریاں کرتے، اور دُور دُور سے اپنے ہمخیال عالموں اور ودوانوں کو بلاتے تھے۔

جس زمانے میں شوکت مرحوم مدرسۂ عالیہ میں ملازم تھے، ایک دن چند آریہ سماجی صدر مدرّس مولانا عبدالمومن صاحب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ ہماری ایک "مجلسِ مباحثہ" ہے، جہاں ہم مسلمانوں اور عیسائیوں کو مناظرے اور بحث مباحثے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کسی مسلمان عالم کو مناظرے کے لیے بھیج دیں۔ مولانا عبدالمومن نے یہ دعوت قبول نہ کی؛ اور ان اصحاب سے کہا کہ یہ مناظرے بیسود ہیں، اور تضیعِ اوقات سے زیادہ نہیں۔ اس پر ان میں سے کسی نے کہا کہ اتنا بڑا شہر اور اتنے سارے مدرسے؛ ہم یہاں کے سب مدرسوں میں گئے، جہاں اسلامیات کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن تعجب ہے کہ کسی نے ہمارا چیلنج قبول نہیں کیا، آخر کیا بات ہے کہ کسی کو ہمارے مقابلے پر آنے کی جرأت نہیں ہوئی؟ شوکت صاحب بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ انھوں نے اس آریہ سماجی کی یہ بات سنی، تو غیرت آئی؛ جواب میں ان صاحب سے کہا کہ میں چلونگا۔ مولانا عبدالمومن بھی ان کا جوش دیکھ کر خاموش ہو رہے۔ اس پر ان صاحب نے پوچھا کہ آپ کس موضوع پر بحث کرنا پسند کرینگے؛ اور ساتھ ہی ان کے ہاتھ میں ایک پرچہ دے دیا، جس پر ہندی میں چند موضوعات کے عنوان لکھے تھے۔ شوکت صاحب کی ہندی سے واقفیت برائے نام تھی، اس لیے وہ پرچہ پڑھنے سے قاصر تھے۔ انھوں نے اپنی لاعلمی پر یوں پردہ ڈالا کہ آپ جو موضوع چاہیں، میرے نام لکھ دیں، مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا۔ اس پر ان لوگوں نے مناظرے کے لیے "روح اور مادّے کی قدامت" کے عنوان کا انتخاب کیا۔

اس مباحثے کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، لیکن اس کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک ہندی اور سنسکرت کا باقاعدہ مطالعہ نہ کیا جائے، اس

میدان میں کماحقہٗ کامیابی محال ہے۔ اس پر انھوں نے ایک پنڈت صاحب سے ٹیوشن کے ذریعے سنسکرت سبقاً سبقاً پڑھی، اور ہندی مفکّرین کی کتابیں اور مذہبی متون ان کی اصلی زبان میں مطالعہ کیے۔ عربی اور فارسی وہ پہلے سے جانتے تھے۔ سنسکرت کے علم نے انھیں ان زبانوں کے تقابلی مطالعے کی قابلیت عطا کردی۔

۱۹۵۹ء میں مختلف اصحاب (جوش ملیح آبادی، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر ابواللیث صدّیقی وغیرہ) کی تحریک پر حکومتِ پاکستان نے اردو کا ایک مکمل تاریخی لغت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کے سامنے آکسفرڈ ڈکشنری کا نمونہ تھا۔ اس کے لیے حکومت نے کراچی میں اردو ترقی بورڈ کی تشکیل کی اور لغت کی ترتیب وتدوین کا کام اس کے سپرد کردیا۔ اسی زمانے میں شوکت صاحب اوّلاً ڈھاکے سے ایک سال کی چھٹی لے کر کراچی آئے اور بطور ماہر اس بورڈ سے وابستہ ہوگئے۔ پھر شعبۂ لغت کے مدیرِ اعلیٰ مولوی عبدالحق بنائے گئے اور ان کی مدد کے لیے تین مدیر مقرّر ہوئے: سیّد ہاشمی فریدآبادی (ف جولائی ۱۹۶۴ء) ڈاکٹر شہیداللہ (ف جولائی ۱۹۶۹ء) اور ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ اس پر وہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے مستعفی ہوگئے۔ لیکن یہ انتظام بھی دوتین برس سے زیادہ قائم نہ رہا۔ اوّل ڈاکٹر شہیداللہ بنگلہ اکاڈمی، ڈھاکہ کے صدر بن کر گئے۔ پھر سیّد ہاشمی فریدآبادی کو کچھ حکومتِ وقت سے اور کچھ مولوی عبدالحق سے شکایات پیدا ہوگئیں، اور وہ کراچی سے لاہور چلے گئے۔ اگست ۱۹۶۱ء میں خود مولوی عبدالحق بھی جنّت سدھارے۔ اب سارے کام کی ذمہ داری شوکت صاحب کے کندھوں پر آپڑی۔ وہ مدیرِ اعلیٰ بنادیے گئے، اور آخر تک اسی عہدے پر متمکن رہے۔ بیشک، ان کے ساتھ عملہ تھا اور ان میں سے بعض اہلِ زبان اور زبان آور بھی تھے، لیکن واقع یہ ہے کہ اشتقاق اور تخریج کا کام شوکت سبزواری کے سوا اور کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ الفاظ کی تشریح

اور تحقیق میں وہ ایسی ہندی کی چندی نکالتے تھے کہ ان کے سب ہمکاران کا لوہا مانتے تھے۔ افسوس کہ ان کی وفات سے قبل اس لغت کی ایک جلد بھی منظرِ عام پر نہ آسکی۔ بہر حال آٹھ جلدیں مکمل ہو چکی تھیں۔ ان کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ رکھنے کو کافی ہے۔

شوکت سبزواری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری اور شعر گوئی سے کیا تھا۔ انھوں نے ہمایوں تخلص اختیار کیا تھا۔ اس زمانے کے پرچوں میں ان کا کلام دستیاب ہو جاتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ لاہور، کے ماہنامے "ادبی دنیا" میں چھپا تھا۔ اسی رسالے میں ان کے بعض عربی مضامین اور افسانوں کے ترجمے بھی شائع ہوئے تھے۔ لیکن بعد کو انھوں نے "نگار" اور "معارف" میں لکھنا شروع کر دیا، اور "ادبی دنیا" سے تعلق منقطع ہو گیا۔ ۱۹۴۶ء میں جب ان کی پہلی سنجیدہ تصنیف "فلسفۂ کلامِ غالب" شائع ہوئی، تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، اور انھیں نکتہ آفرینی اور بات سے بات پیدا کرنے کا کیسا ملکہ حاصل ہے۔ اس کے مدّتوں بعد "اردو زبان کا ارتقا"، شائع ہوئی (ڈھاکہ ۱۹۵۶ء)۔ یہ دراصل ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، جس میں انھوں نے اردو زبان کے آغاز اور اس پر دوسری زبانوں کے اثرات کی تاریخ بیان کی ہے۔ ان کی تین کتابیں لسانیات سے متعلق ہیں، "داستانِ زبانِ اردو" (دلّی ۱۹۶۱ء)، "لسانی مسائل"، "اردو لسانیات" آخر الذکر دونوں مضامین کے مجموعے ہیں۔ "اردو لسانیات" پر انھیں ۱۹۶۶ء میں "داؤد ادبی انعام" (پانچ ہزار روپے) دیا گیا تھا۔ ایک اور کتاب "غالب: فکر و فن" بھی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے تھے، انھیں دو جلدوں، "معیارِ ادب" (کراچی ۱۹۶۱ء) اور نئی پرانی قدریں" میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ہنوز بہت مضمون منتشر حالت میں پڑے ہیں۔

ان کا ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء صبح کے وقت کراچی میں انتقال ہوا؛ تدفین اسی شام عمل میں

آئی۔ تاریخ ہوئی: "فراق شوکت سبزواری"۔ قبرستان "الطاف نگر" میں دفن ہوئے۔

شوکت صاحب کی شادی ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر سید مبارک علی کی بڑی صاحبزادی ہاجرہ بیگم سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی رشتے میں ان کے ماموں ہوتے تھے۔ یہ اس طرح کہ وہ شوکت صاحب کی والدہ (علیم النسا بیگم) کے حقیقی ماموں ڈاکٹر سید بنیاد علی کے بیٹے تھے (شوکت صاحب کی نانی کا نام بنیادی بیگم تھا) ڈاکٹر سید مبارک علی بھی اپنے والد (ڈاکٹر سید بنیاد علی) کی طرح سالوتری تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے ہاپوڑ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں رحلت کی اور اپنے خاندانی قبرستان (نزد عیدگاہ ہاپوڑ) میں دفن ہوئے۔

ہاجرہ بیگم کے بطن سے ان کے دو بیٹیاں (حمیدہ اور ریحانہ) اور تین بیٹے (عارف اختر، اور راشد اظہر اور طارق انور) موجود ہیں۔ دونوں بچیوں کی شادی ہوچکی ہے، اور وہ اپنی اپنی جگہ آرام و آسایش کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بڑے صاحبزادے عارف اختر انگلستان میں (غالباً ایک کارخانے میں ٹیکسٹائل انجینیر کے عہدے پر) کام کرتے ہیں۔ چھوٹے دونوں لڑکے پاکستان میں ہیں۔

شوکت صاحب نے اس بیگم کو اپنی ڈھاکے کی ملازمت کے زمانے میں طلاق دے دی، اور اس کے بعد انھیں کی چھوٹی بہن سلطانہ بیگم سے نکاح کرلیا تھا، لیکن وہ آخر تک ہاجرہ بیگم کے بھی کفیل رہے (بلکہ وہ رہتی بھی اسی گھر میں تھیں)۔ دوسری بیگم کی اولاد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔

ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر

۱۸ ستمبر ۱۹۱۶ء کو مراد آباد کے سربرآوردہ مخلوط سنّی / شیعی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کی ایک خاتون راجہ محمود آباد کے عقدِ نکاح میں آئیں، تو اس کے بعد کچھ لوگ اثنا عشری مسلک کے پیرو بن گئے۔ انھیں میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے دادا بھی تھے۔ انھوں نے مراد آباد کی سکونت ترک کر دی اور لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا۔

ذاکر حسین کے والد دلدار حسین کا نکاح نواح بارہ بنکی (یوپی) میں موضع بشن پور کے شیخ ریاست علی خان کی بیٹی سے ہوا تھا۔ ذاکر حسین اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کی ولادت اپنی ننھیال بشن پور میں ہوئی، اور ان کی والدہ ان کی ولادت کے وقت انتقال کر گئی تھیں۔ ذاکر حسین نے ۱۹۳۴ء میں دسویں درجہ کی سند لینے کے بعد کرسچین کالج، لکھنؤ میں داخلہ لے لیا، اور سال بعد ۱۹۳۸ء میں یہاں سے بی اے کا امتحان پاس کیا، گھر کی مالی حالت کچھ بہت تسلّی بخش نہیں تھی۔ تعلیم کا سارا زمانہ یوسف حسین صاحب بیرسٹر لکھنؤ نے ان کی سرپرستی کی، بلکہ یہ انھیں کی کوٹھی میں رہتے تھے اور انھوں نے ہر طرح ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کی۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ والد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سنّی، شیعہ اختلاف کا میدان بنا ہوا تھا۔ ایک طرف سے مدحِ صحابہ کے جلسے اور جلوس نکل رہے تھے، تو دوسری طرف سے تبرّائیوں کے۔ ذاکر حسین بہت اچھے مقرر تھے، خوش لہجہ

اور خوش بیان۔ اگرچہ تبرّا سے کوسوں دور تھے، لیکن بہرحال شیعی جلسوں میں انھیں بھی خطاب کرنا پڑتا تھا۔ جب فریقین کی سرگرمیوں کے باعث شہر میں نقضِ امن کا خطرہ پیدا ہوگیا، تو حکومت مداخلت پر مجبور ہوگئی۔ متعدد حضرات کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوگئے؛ انھیں میں ذاکر حسین بھی تھے۔ کسی نے بروقت انھیں متنبہ کردیا۔ یہ گھبرا کر بھاگ نکلے، اور بمبئی پہنچ کر دم لیا۔ اس کے بعد بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

اس تحریک اور ذاکر حسین کی اس میں شرکت کا ان کے لیے ذاتی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ فاروقی لکھنے لگے۔ اگرچہ ان کا خاندان فاروقی تھا لیکن شیعیت اختیار کرنے کے بعد تقریباً سب نے یہ نسبت لکھنا ترک کردی تھی۔ ذاکر حسین صاحب نے اس کی تجدید کی۔

بمبئی میں سب سے پہلی ملازمت اسمٰعیل بیگ محمد ہائی اسکول میں پڑھانے کی ملی۔ مشاہرہ قلیل اور حوصلے بلند، کب تک یہاں پڑے رہتے! بارے، کچھ مدّت بعد ڈیوڈ ساسون ہائی اسکول میں جگہ مل گئی، اور تنخواہ بھی زیادہ ملی۔ اس اسکول میں بہت دن رہے۔ اس زمانے کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے:

ذاکر حسین بمبئی کارپوریشن کے انتخاب میں کھڑے ہوئے۔ خود مسلمانوں نے ان کی مخالفت کی۔ وجہ؟ یہ یہودیوں کے اسکول میں ملازم ہیں۔ نتیجہ؟ یہ انتخاب ہار گئے اور ان کا مخالف جیت گیا۔

بہرحال انتخاب میں ہار جانے کی وجہ سے ان کی ملازمت پر کوئی آنچ نہیں آئی اور بظاہر وہ جب تک چاہتے، اس اسکول میں رہ سکتے تھے۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ ان کا محض بی، اے ہونا (اور ایم اے نہ ہونا) ان کی ترقی کے رستے میں حائل ہو رہا تھا۔ اس پر انھوں نے ۱۹۴۸ء میں پرائیوٹ طور پر ایم اے کا امتحان پاس کرلیا۔ اس کے بعد وہ مہاراشٹر کالج آف آرٹس سائنس، بمبئی میں اردو، فارسی اور اسلامیات پڑھانے پر مقرر ہوگئے۔ اب انھوں نے مشہور مرثیہ گو

شاعر میرزا سلامت علی دبیر کے حالات اور ان کے شاگردوں کے سلسلے میں مواد جمع کیا اور ایک مبسوط مقالہ لکھ کر بمبئی یونیورسٹی میں پیش کر دیا، جس پر انھیں ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی (پی ایچ ڈی) کی سند ملی۔ یہ وقیع مقالہ "دبستانِ دبیر" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ (لکھنؤ ۱۹۶۶ء)

۱۹۶۶ء میں افریقا شیعہ فیڈریشن کے سابق صدر الحاج ابراہیم حسین شریف ونوجی نے ان سے فرمائش کی کہ آپ افریقا آئیں، اور ہمیں وہاں کے شیعی مدارس کے لیے دینی نصاب مرتب کرنے میں مدد دیں۔ اس پر وہ چند ماہ کے لیے افریقا گئے اور یہ نصاب تیار کر دیا۔ یہ اردو اور گجراتی دونوں زبانوں میں چھپ چکا ہے۔ الحاج ابراہیم حسین شریف اور افریقا کے بعض اداروں نے ان کی جو خدمت کی تھی، اس سے ان کی مالی حالت بہت کچھ سدھر گئی؛ اور انھیں اس کے بعد کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اپنی وفات سے پہلے وہ ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی سند کے لیے قصائد سے متعلق ایک مقالہ قلمبند کرنے میں مصروف تھے۔ اس میں قصیدے کی تاریخ، اور عربی، فارسی اور عربی اردو میں قصیدے کے ارتقا پر نظر ڈالنے کا ارادہ تھا۔ ہنوز اس کام سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۳ء کی شب میں ڈھائی بجے (یعنی ۲۵ مارچ علی الصبح) خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔ جنازہ ۲۵ مارچ ہی کو دن کے دس بجے اٹھا اور انھیں شیعیوں کے مرکزی قبرستان 'رحمت آباد' میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

۱۹۴۵ء میں سرورِ نذیر حسن کے سب سے چھوٹے بھائی سیّد شبیر حسن قتیل کی صاحبزادی حور جہاں (عرف قمر جہاں بیگم) سے شادی ہوئی تھی۔ ان سے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔

انھوں نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ اپنے قیامِ لکھنؤ کے زمانے ہی میں اختیار کر لیا تھا۔ ان کا عنفوانِ شباب تھا کہ مولانا مجتبیٰ حسن کاموں پوری (صدر شعبۂ

دینیاتِ شیعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے لکھنؤ میں شیعہ سوسائٹی قائم کی۔ فاروقی صاحب نے ان کی فرمائش پر دینی موضوعات کے بارے میں کئی رسالے لکھے، اس سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئے۔ لکھنؤ میں ان کا متعدد اخباروں اور رسالوں سے بھی تعلق رہا۔ اسی زمانے میں انھوں نے سیّد شبیر حسن قتیل کے مشہور ہفتہ وار "قتیل" میں بھی کام کیا۔ بمبئی میں بھی یہ صحافتی سرگرمیاں جاری رہیں۔ یہاں انھوں نے مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن میں بھی دلچسپی لینا شروع کی اور اس کے ہفتہ وار پرچے "پرداز" میں باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ ان کے علاوہ دو روزانہ اخباروں "انقلاب" اور "ہندوستان" سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ ان میں ان کے مضامین بلکہ اداریے تک شائع ہوتے تھے۔ ان کی مطبوعہ تصانیف میں مندرجۂ ذیل قابلِ ذکر ہیں:۔

ادبِ لطیف (اردو ادب کی مختصر تاریخ)؛ دبستانِ آرزو (آرزو لکھنوی کے حالات)؛ سیماب اکبرآبادی؛ سیر شکوہ آبادی؛ دبستانِ دبیر؛ (شبیہہ پیغمبر حضرت علی اکبر کے سوانح)؛ ہاشمی مجاہد؛ ربّانی حکومت؛ فتحِ مبین؛ جمہوریت اور اسلام؛ مسلم لیگ کیوں؟

گہرؔ گورکھپوری، ایشوری پرشاد

مشرقی یوپی میں گورکھپور کئی لحاظ سے اہم شہر ہے۔ اگرچہ یہاں اردو ادب سے دلچسپی لینے والے شروع سے رہے، لیکن ریاض خیرآبادی کے ۱۸۸۱ء میں ورود کے بعد شہر کی فضا شعر و شاعری کے لیے بہت سازگار ہو گئی۔ کائستھ حضرات، اسلامی دورِ حکومت کے شروع ہی سے اردو اور فارسی میں پیش پیش تھے؛ ان کی گورکھپور اور اس کے نواح میں بھی اچھی خاصی آبادی ہے۔ وہ بھی علم و ادب کے اس ماحول میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گورکھپور کے شعرا میں اچھی خاصی تعداد کائستھ حضرات کی ہے۔

ان میں ایک صاحب حیثیت بزرگ منشی پراگ دت سریواستو تھے۔ ان کی وسیع جاداد اور زمینداری تھی۔ انھیں کے بیٹے منشی منگل پرشاد (عرف چھُنّی لال) گہرؔ کے والد تھے۔ گہرؔ پانچ بھائی تھے؛ ایک بھائی اُن سے بڑا تھا اور تین چھوٹے۔ گہرؔ ۱۹۱۱ء میں اپنے جدّی مکان محلّہ قاضی پور خُرد، گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر میاں صاحب جارج اسلامیہ اسکول میں داخلہ لیا، جو اب انٹر کالج کے درجے کو پہنچ چکا ہے[^1]۔ لیکن تعلیم

[^1]: گورکھپور میں ایک خاصا بڑا امام باڑہ ہے، اور اس کے لیے ایک وقف ہے۔ اسے نواب آصف الدولہ نے تعمیر کرایا، اور اس دور کے ایک صاحبدل درویش روشن علی شاہ کو اس کا متولّی مقرّر کیا تھا۔ ان کے بعد سب متولّی احتراماً "میاں صاحب" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ موجودہ متولی (میاں جواد علی شاہ) نے اسکول کے لیے زمین وقف کی، تو اسکول کے نام میں "میاں صاحب" کے الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا۔

جاری نہ رہ سکی۔ آٹھویں درجے میں ناکام رہنے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ چونکہ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، اس لیے کسی نے اس کی پروا بھی نہ کی۔ انھوں نے البتہ اپنے طور پر اردو، فارسی کا مطالعہ جاری رکھا اور رفتہ رفتہ خاصی استعداد پیدا کر لی۔

۱۹۳۰ء میں شعر گوئی کا آغاز ہوا، تو اس میں ضامن علی جلال لکھنوی (ف ستمبر ۱۹۰۹ء) کے شاگرد عبدالمجید فہیم گورکھپوری (ف ۱۹۳۳ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ بیفکری کا زمانہ، شعر و شباب اس پر مستزاد، اس نے انھیں کوچۂ حسن میں پہنچا دیا، اور رہی سہی کسر شراب نوشی نے پوری کر دی۔ ساری عمر تجرّد میں بسر ہوئی۔

جہاں یہ اطوار ہوں، وہاں قارون کی دولت بھی کفالت نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بزرگوں سے جو کچھ ورثے میں ملا تھا، وہ جلد ہی ٹھکانے لگ گیا اور کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ ملنے والوں نے جب یہ حالت دیکھی، تو آنکھیں چرانے لگے۔ صحت بھی روز بروز گرنے لگی۔ ۱۹۶۶ء میں فالج کا حملہ ہوا۔ علاج معالجے سے بچ تو گئے، لیکن اس کے بعد پوری صحت ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ جگر، جو کثرتِ شراب نوشی سے تباہ ہو چکا تھا، جواب دینے لگا۔ بہت بیمار ہو گئے۔ چند دن کس مپرسی کے عالم میں گزرے۔ دوستوں کو خبر ملی، تو انھوں نے ڈسٹرکٹ اسپتال میں پہنچا دیا۔ وہیں ۱۵ جون ۱۹۷۳ء شام کے پانچ بجے، جان بحق ہو گئے۔ ارتھی اگلے دن (۱۶ جون) قبلِ دوپہر نکلی، اور دریائے راپتی کے کنارے راج گھاٹ پر اسے نذرِ آتش کر دیا گیا۔

اگرچہ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن ہے یہ کہ وہ غزل کے شاعر تھے۔ دیوانِ اردو "سلکِ گہر" ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ (گورکھپور ۱۹۶۹ء) سلکِ گہر ہی کا کچھ منتخب کلام دیوناگری رسم الخط میں "مالا" کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے۔ اگرچہ ان کے کلام میں کوئی غلطی نہیں۔ زبان

اور فن کے پہلو سے بھی اس میں کوئی سقم نہیں ہے لیکن کوئی جدت یا خاص بات بھی نہیں؛ وہی روایتی انداز جو ازل سے ہمارے شعرا کا طرۂ امتیاز رہا ہے، ان کے ہاں بھی ملتا ہے۔

نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

دردِ دل کی بیقراری کچھ نہ پوچھ — جس نے بھی دیکھا مجھے، گھبرا گیا

اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے ہم، سامانِ زیست — اس نے تو شیرازۂ ہستی پریشاں کر دیا

ہائے، چاہا جو کچھ، کیا اس نے — کچھ بھی میرا، گھر اکیا نہ ہوا

جس قدر سنتے گئے وہ داستانِ غم، گھرا — دل مرا اتنا ہی مشتاقِ بیاں بنتا گیا

یوں آئینے میں رنگِ جنوں دیکھتے رہے — جیسے کہ مل رہے ہیں کسی اجنبی سے ہم

ملتی نہ تھی دنیا میں کہیں راحتِ ہستی — میخانے میں پہنچے ہیں، تو غم بھول گئے ہیں

جی کے بہلانے کو اکثر پی لیا کرتے ہیں ہم — کیا خبر تھی، مے ہماری زندگی ہو جائیگی

کیا جانے، کیا ملیگا تری بارگاہ سے — ہم کو خیالِ تنگیٔ داماں ابھی سے ہے

حشر سیتاپوری، سیّد محمدؐ کاظم

سیتاپور کے محلّہ قضیارہ کے قاضی سیّد محمد عسکری کے صاحبزادے تھے، جو ساری عمر سرکاری ملازم رہے اور سب رجسٹرار کے عہدے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ ان کا خاندان ساداتِ رضوی سے تھا اور وہ حضرت امام رضا کی نسل سے تھے، لیکن کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ کبھی اپنے نام کے ساتھ رضوی کی نسبت نہیں لکھی۔

حشر صاحب تین بھائی تھے۔ سب سے بڑے سیّد محمد طاہر (انجن میاں) دیوانی کے مشہور وکیل تھے۔ وہ مدتوں سیتاپور بار ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ چھوٹے قاضی سیّد محمد تقی عاتف سیتاپوری تھے۔ (ف ۱۹۷۱ء)

حشر ۱۸۹۵ء میں سیتاپور میں پیدا ہوئے۔[ف] اس زمانے کے رواج کے مطابق نجی تعلیم کے بعد، جو قرآن شریف اور اردو فارسی پر مشتمل تھی، سیتاپور کے سرکاری اسکول میں بھیج دیئے گئے۔ دسویں کی سند لینے کے بعد لکھنؤ کے قدیم کالج میں داخلہ لیا؛ اور یہاں سے بی اے پاس کیا۔

اس زمانے میں ریاست محمود آباد کی علم دوستی کی شہرت تھی۔ راجہ سر محمد علی محمد خان والی محمود آباد خود بھی شعر کہتے تھے؛ سحر تخلص تھا۔ وہ شاعروں اور ادیبوں کے قدردان تھے۔ چنانچہ لکھنؤ کے کئی شاعر مثلاً عزیز لکھنوی، ظریف لکھنوی،

ف بہت دن بعد خان بہادر مسعود حسن مسعود نے ان کی تاریخ ولادت کہی:

بافضلِ کردگار شدہ حشر در وجود	بینم کہ در بہارِ جہاں نسترن شگفت
سالِ ولادتش دلِ مسعود جستہ است	ایں سالِ عیسوی است کہ "بخت چمن شگفت"

(۱۸۹۵)

(عندلیب نمبر: تاریخ ۷۴۳)

ثاقب لکھنوی وغیرہ ان کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی حشر کو کالون کالج، محمود آباد میں ملازمت مل گئی۔ اگرچہ شعر وہ اس سے پہلے ہی کہنے لگے تھے، لیکن دراصل اُن کے ذوقِ سخن کی تربیت محمود آباد کے قیام، اور ان اساتذۂ وقت کی صحبت کی، رہینِ منّت ہے۔ لیکن خود انھوں نے اپنے کلام پر احمد حسین (عرف ممدو میاں) ہاتف سیتاپوری (ف ۹ جولائی ۱۹۲۷ء) سے اصلاح لی۔

جب راجہ سر محمد علی محمد خان مرحوم کو ان کے بارے میں علم ہوا، تو انھوں نے انھیں کالج سے بلوا کر تحصیلدار مقرر کر دیا۔ ان کی وفات (جولائی ۱۹۲۷ء) کے بعد ان کے صاحبزادے راجہ محمد امیر احمد خان (ف اکتوبر ۱۹۷۳ء) کے عہد میں بھی یہ ریاست کے ملازم رہے۔ ۱۹۵۲ء میں زمینداری کا خاتمہ ہوا، تو حشر صاحب محمود آباد کی ملازمت ترک کر کے لکھنؤ کے ایک فوجی دفتر میں ملازم ہو گئے۔ لیکن یہاں نبھ نہ سکی، اور مستعفی ہو کر سیتاپور چلے آئے؛ اس کے بعد پھر کہیں باہر نہیں گئے۔

اپنی طویل عمر میں بہت کچھ کہا: نوحہ، سلام، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، غزل — غرض کسی میدان میں بند نہیں تھے۔ بلکہ بعض تاریخی ڈرامے بھی لکھے۔ افسوس، مجموعۂ کلام آج تک شائع نہیں ہو سکا؛ اور اب اس کے شائع ہونے کا امکان بھی کیا رہ گیا ہے!

طویل علالت کے بعد ۷ جون ۱۹۷۳ء کو رختِ سفر باندھا اور اپنے خالق کے پاس حاضر ہو گئے۔ سیتاپور ریلوے اسٹیشن کے قریب کربلائے سلیم پور میں دفن ہوئے۔

اولادِ جسمانی میں تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ تینوں لڑکے برسرِ روزگار ہیں؛ بڑے گورکھپور یونیورسٹی میں ملازم ہیں۔

بہت مشکل سے چند شعر جناب وصی سیتاپوری کی وساطت سے ملے ہیں، وہی حاضر ہیں:

شبِ غم آنکھوں میں کٹ جاتی ہے — تم نہ آتے ہو، نہ نیند آتی ہے
جَور کے ذکر پہ تم کیوں بگڑے! — بات دنیا کی کہی جاتی ہے
حُسن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے — عشق کی بات رہی جاتی ہے

مرے حصے کے تھے سب درد و غم کیا! — ستم ایجاد اب ترکِ ستم کیا!
شعارِ حسن ہے شہرت پسندی — محبت کا کوئی رکھے بھرم کیا!

ایک اُدا میں سو سو ناز — حُسن ہے کتنا عشق نواز
مجھ کو مسلسل تیری تلاش — عشق کا ایک انجام آغاز

کوئی میخوار اس محفل سے پیاسا جا نہیں سکتا
ہمیشہ سے غمِ ہستی کا گردش میں ہے پیمانہ

دفورِ غم میں بھی ہو لطفِ زندگی پیدا — صلاحیت تو کرے خود میں آدمی پیدا
بڑے مزے سے گذر جائیگی فراق کی رات — ترے خیال سے کر لی ہے دوستی پیدا

خضر کترا کے نکل جاتے ہیں راہِ عشق سے — ایک مدت ہو چکی ہے ان کو دنیا دیکھتے

ترا راز راز نہ رہ سکا، کسی طرح پردۂ راز میں
وہ حقیقتوں کی تجلّیاں نظر آئیں مجھ کو مجاز میں

اشکِ چشمِ خونفشاں کو کیا کروں! — عشق کے اس رازِ دردِ دل کو کیا کروں!

طے ہو رہے ہیں عشق کے پُرپیچ راستے — منزل پہ رفتہ رفتہ چلا جا رہا ہوں میں

کیا تکلّم کا ترے انداز ہے — ذرّہ ذرّہ گوش بر آواز ہے

یہ عالم ہوا دل کا ضبطِ فغاں سے — کہ حرفِ طلب بھی نہ نکلا زباں سے

اسے جس طرح چاہے ہنس ہنس کے سنیئے — مرا ذکر میری زبانی نہیں ہے

دم ہے رُکا لبوں پہ ترے انتظار میں — پھر آ خیالِ دوست کہ ٹھہرا ہوا ہوں میں

عشق سے قبل مجھ کو عطا دل ہوا — درد سے پہلے درد آشنا مل گیا

بے معرفت سہی، مرا حُسنِ یقیں تو دیکھ
سجدہ پہ کر رہا ہوں میں سجدہ ترے بغیر

دل کا کیا اعتبار الفت میں! آج اپنا ہے کل پرایا ہے

کچھ ایسا فرق تو ہستی و نیستی میں نہیں، حیات و موت کی حد آدمی کا اک دم ہے

نغمۂ وحدت کا ہم آہنگ کتنا ساز ہے سیکڑوں پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے

ہم کو تلقینِ ترکِ عشق فضول اپنا اچھا برا سمجھتے ہیں

اپنا سب کچھ مانتا ہوں میں تمہیں تم کو بھی تو کچھ سمجھنا چاہیے

ایک وہ دن تھا کہ میں راہبرِ منزل تھا اب غبارِ رہِ منزل لیے جاتا ہے مجھے

حُسن کی ہر بات کا اس کو یقیں عشق سا دیکھا نہیں نے سادہ دل

عزّتِ نفس جس میں ہو برباد حشر! اس دوستی سے ڈرتا ہوں

حُسن کی دنیا عینِ کمال عشق کی دنیا عینِ یقیں

کیا قیامت کر گئی محشر میں وہ نیچی نظر
ہم نے خود شکوہ کیا، اور خود پشیماں ہو گئے

جعفر حسن (جافر حسن)، ڈاکٹر

کون ہے جس نے سرسیّد کے یارِ غار اور دستِ راست نواب محسن الملک کا نام نہیں سنا ہوگا! ان کا نام مہدی علی تھا اور وہ اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ وہ متوسط طبقے کے فرد تھے، لیکن ان کی قابلیت اور محنت، دیانت داری اور معاملہ فہمی اور فرض شناسی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب رسمی تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے ملازمت شروع کی ہے، تو صرف دس روپلے مشاہرے پر (محرّر) بھرتی ہوئے تھے۔ اور جب ملازمت ختم کی اور پنشن پر سبکدوش ہوئے، تو اس وقت ان کا مشاہرہ دو ہزار روپلے تھا اور ماہانہ پنشن ۸۰۰ روپلے (حالی) مقرر ہوئی۔ وہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو شملے میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ لاش علی گڑھ لائی گئی اور سرسیّد کے پہلو میں سپردِ خاک ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

مہدی علی جب ملازم ہو کر حیدر آباد (دکن) گئے، تو انھوں نے اپنے خاندان کے ہر اس شخص کو وہاں ملازمت دلوائی، جو حیدر آباد جانے پر تیار تھے۔ انھیں میں ان کے چھوٹے بھائی امیر حسن بھی تھے۔ امیر حسن رفتہ رفتہ اول تعلقدار کے عہدے تک پہنچے اور انھوں نے اسی عہدے سے ۱۹۱۴ء میں پنشن پائی۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے:

بہت دن کی بات ہے، جب میں نے "حیاتِ مہدی" مصنفہ امین زبیری میں خاندان کا حال پڑھا، تو دیکھا کہ معمول کے خلاف اس میں شجرے کا کوئی اندراج نہیں ہے، حال آں کہ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان کا خاندان سیّد تھا۔ اس پر میں نے مہدی علی

(محسن الملک کے بھتیجے (ڈاکٹر جعفر حسن) جافر حسن نے دریافت کیا کہ ذرا اپنے خاندان کے ہندستان آنے کی تاریخ پر کچھ روشنی ڈالیے اور بتائیے کہ حضرت علیؑ تک کتنی پشتیں ہیں۔ اس پر انھوں نے سرے سے اپنے خاندان کے سیّد ہونے کی تغلیط کی اور لکھا:

> ہم لوگ سیّد نہیں۔ معلوم نہیں، کس نے اپنی مشیخت جتانے کو سیادت کا دعویٰ کیا۔ اسی لیے نہ کبھی میں نے، نہ ہادی حسن اور عابد حسن سفرانی نے اپنے نام کے ساتھ سیّد کا لفظ لکھا۔

نواب محسن الملک کا خاندان عقیدے کے لحاظ سے مخلوط تھا، ایک بھائی سنّی، تو دوسرا شیعی۔ سنّی مردوں کی شادی شیعی عورتوں سے، اور شیعی مردوں کی شادی سنّی عورتوں سے، ان کے ہاں کا عام دستور تھا۔ نواب محسن الملک جب سنّی ہو گئے، تو انھوں نے اہلِ سنّت کی تائید اور تشیع کے رد میں اپنی مشہور کتاب "آیاتِ بیّنات" لکھی (۱۸۷۰ء)۔ ان کے چھوٹے بھائی امیر حسن شیعی تھے۔ انھوں نے "آیاتِ بیّنات" کے جواب میں "آیاتِ محکمات" تصنیف کی؛ لیکن دونوں کے درمیان تعلّقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔

امیر حسن مجلس کرتے اور مرثیہ بھی پڑھتے تھے۔ انھیں تحت لفظ پڑھنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ہر سال محرّم میں تین چار اور صفر میں دو بڑی مجلسیں ان کا معمول تھا؛ اور ان میں خود ہی پڑھتے تھے۔ وحید کا مرثیہ جس کی ایک ٹیپ کا شعر ہے:

> جان، یوں تن سے مرے، اے شہِ خوش خو نکلے
> جس طرح، وقتِ سحر، پھول سے خوشبو نکلے

انھیں بہت پسند تھا؛ اور دوسرے تیسرے برس وہ یہ مرثیہ ضرور پڑھتے تھے۔ ۱۷ جون ۱۹۳۷ء کو حیدر آباد میں رحلت کی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

امیر حسن صاحب کی اولادِ نرینہ میں چھ بیٹے تھے: مہدی حسن، بدرالحسن، جعفر حسن، ہادی حسن، ضیاء الحسن، عابد حسن۔ بدرالحسن کا اپنے زمانے میں

حیدر آباد کے آزاد خیال اور جمہوری تحریک کے لیڈروں میں شمار ہوتا تھا۔ افسوس، ان کا عین عالمِ شباب میں انتقال ہو گیا۔ ہادی حسن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے کامیاب پروفیسر رہے، بہت اچھے مقرر تھے، اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی۔ ان کا سنہ ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا۔ عابد حسن (سفرانی) دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی ہندستانی فوج میں رہے اور آزادیِ وطن کے بعد وزارتِ خارجیہ میں لے لیے گئے تھے۔ وہ مختلف ممالک میں ہندستان کے سفیر رہنے کے بعد اپریل ۱۹۶۹ء میں ملازمت سے پنشن پر سبکدوش ہوئے، آج کل حیدر آباد میں قیام ہے۔ ضیا الحسن کا بہت کم عمری میں انتقال ہو گیا۔

جعفر حسن ۱۲ اگست ۱۹۰۴ء کو پربھنی میں پیدا ہوئے، جہاں اُن دنوں اُن کے والد امیر حسن صاحب اوّل تعلقدار کے عہدے پر فائز تھے۔ والد کے تبادلے کے ساتھ یہ بھی مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔ چنانچہ ان کا بچپن رائچور، گلبرگہ، پٹن چرو، ناندیڑ وغیرہ میں بسر ہوا۔ ان کے والد کے ہاں بچوں کی انگریزی تعلیم کے لیے ایک اینگلو انڈین خاتون (مسز بوئینؔ) مستقلاً ملازم تھیں۔ وہ گھر ہی میں رہتی تھیں اور جہاں کہیں امیر حسن صاحب کا تبادلہ ہوتا، وہ بھی ساتھ جاتیں۔ اردو، فارسی، ریاضی، ناظرہ قرآن وغیرہ پڑھانے کے لیے، جہاں جاتے، وہاں کسی مقامی مولوی کا انتظام کر لیا جاتا۔ جعفر حسن صاحب کی تعلیم بھی اسی نہج پر ہوئی۔ جب دس برس کے ہوئے، تو انھیں ۱۹۱۴ء میں مدرسۂ عالیہ، حیدر آباد میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں دسویں درجے کی سند حاصل کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی نئی نئی قائم ہوئی تھی، حیدر آباد کے امرا کا طبقہ اسے کسی

ؔ بسبیل تذکرہ، حیدر آباد کے مشہور میرِ عمارت اسٹرائرک مَیرٹ ان مسز بوئین کے بھانجے ہیں۔ حیدر آباد کی بعض عالیشان اور قابلِ دید عمارتوں کے نقشے انھیں نے تیار کیے تھے۔ وہ آج کل انگلستان میں مقیم ہیں۔

قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ لوگ اسے گھٹیا درجے کی درسگاہ سمجھتے تھے۔ اس لیے جب جعفر حسن نے یہاں داخلہ لیا، تو خاندان کے بعض لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی؛ اور اس وقت تک دم نہیں لیا، جب دو سال بعد انھیں یورپ نہیں بھیج دیا گیا۔

نومبر ۱۹۲۲ء میں وہ جرمنی گئے؛ وہاں پانچ برس رہے۔ اس دوران میں انھوں نے ۱۹۲۵ء میں برلن یونیورسٹی سے جرمن زبان اور ادبیات کا ڈپلوما حاصل کیا اور دو سال بعد ۱۹۲۷ء میں جرمنی کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہائیڈل برگ سے سماجیات (سوشیالوجی) اور معاشیات (اکنامکس) میں ڈاکٹریٹ (ڈی فل) کی سند لی۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: ہندستان کا افلاس۔ یہ مقالہ انھوں نے جرمن زبان میں لکھا تھا اور یہ اسی زمانے میں چھپ گیا تھا (ہائیڈل برگ ۱۹۳۱ء)

ہندستان واپس آنے کے بعد وہ سب سے پہلے ۱۹۲۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں جرمن کے مدرّس (لیکچرر) مقرر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ طلبہ کو معاشیات اور سماجیات کا درس بھی دیتے تھے۔ دو سال بعد (۱۹۳۰ء) وہ جرمن اور سماجیات کے شعبے میں ریڈر بن گئے۔ ان ایّام میں یہاں سماجیات کا شعبہ الگ نہیں تھا؛ یہ انھیں کی کوششوں سے ۱۹۴۵ء میں کھلا اور وہ صدر شعبہ مقرر ہوئے؛ ۱۹۴۸ء میں ترقی ہوئی اور وہ پروفیسر بنا دیے گئے۔ ان کا ۳۳ برس تک عثمانیہ یونیورسٹی سے تعلق رہا۔ اور ۱۹۶۱ء میں یہاں سے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اردو سے ان کی دلچسپی طالبعلمی کے زمانے کی دین تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلیمی زمانے میں وحید الدین سلیم پانی پتی (ف ۱۹۲۸ء) ان کے اردو کے استاد تھے۔ سلیم کی تدریسی قابلیت اور علمی ذہانت اور جدّت طرازی کے سب معترف ہیں۔ ان کی "وضع اصطلاحات" جواب کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکی ہے، ایک عہد آفریں

تصنیف تھی۔ الیاس برنی (ف جنوری ۱۹۵۹ء) جعفر حسن کے معاشیات کے استاد تھے۔ انھوں نے اپنی دو کتابوں "علم المعیشت" اور "معیشت الہند" کے باعث بہت شہرت حاصل کی۔ وہ "ہندوستانی مالیات" کے موضوع پر بھی ایک کتاب لکھ رہے تھے، لیکن ابھی یہ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ادبیات کی طرف پھسل گئے اور اردو نظم کے انتخابات شائع کرنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے "جذباتِ فطرت" کے عنوان سے غالباً بارہ جلدیں شائع کی تھیں۔ لیکن وہ ادبیات ہی پر قانع نہ رہ سکے۔ اور آگے نکل گئے، تو مناظرانہ انداز کی مذہبیّات تک پہنچ گئے۔ غرض انھوں نے اپنا اصلی میدان (معاشیات اور مالیات) چھوڑ کر بہت وقت ضائع کیا؛ اور اس سے اردو کا بہت نقصان ہوا۔ اگر وہ معاشیات اور مالیات ہی کے لیے وقف رہتے، تو خیال کیجیے کہ ان کی بدولت آج اردو کا دامن کتنا مالامال ہوتا۔

ڈاکٹر عبدالستّار صدّیقی بھی اس زمانے میں یہیں تھے (ف جولائی ۱۹۷۲ء) ان کا اردو سے عشق اور لسانیات سے شغف کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ غرض ایسے اساتذہ کی صحبت اور رہبری سے جعفر حسن کا متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ اُردو انھوں نے گھر پر پڑھی تھی۔ "پھول" (ہفتہ وار) گھر پر آتا تھا اور ان کے مطالعے میں رہا تھا۔ ان اصحاب کے میل جول نے سونے میں سہاگے کا کام کیا اور انھیں اُردو لکھنے کی ترغیب ہوئی۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعۂ تعلیم تھی۔ ڈاکٹر جعفر حسن یہاں استاد مقرّر ہوئے، تو وہ بھی سماجیات کا سا جدید مضمون اردو میں پڑھانے پر مجبور تھے یہاں نئی نئی اصطلاحوں سے واسطہ پڑا، جن کے لیے اردو میں کوئی مترادف موجود نہیں تھا؛ یہ انھوں نے اپنی اپج اور ذہانت سے وضع کرنا شروع کیں۔ ان کا اصول یہ تھا کہ ہمیں فارسی اور عربی کے بجائے ان اصطلاحات کی بنیاد ہندی اور سنسکرت پر رکھنا چاہیے، جو اردو کے خاندان کی زبانیں ہیں۔ ضمناً یہاں یہ

بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ڈاکٹر جعفر حسن کی والدۂ ماجدہ (فخرالحاجیہ) ایرانی نژاد تھیں، اس لیے فارسی گویا ان کی مادری زبان تھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ مرہٹواڑہ (پربھنی) میں پیدا ہوئے، اور چونکہ ان کی زندگی کے ابتدائی ۱۴ سال وہیں گذرے، اس لیے وہ مرہٹی اور ہندی پہلے ہی جانتے تھے۔ لیکن اب ملازمت کے بعد انھوں نے ہندی کا غائر مطالعہ کیا اور اس سے انھیں واقعی بہت فائدہ ہوا۔ دو ڈھائی سال کی محنت اور مطالعے سے ہندی میں اتنی اچھی مہارت ہو گئی کہ ۱۹۳۱ء میں انھوں نے ہندی شاعری پر "منتخباتِ ہندی کلام" کے عنوان سے اپنی پہلی کتاب شائع کی۔ اس میں کبیر، تلسی، رحیم، میرابائی وغیرہ کے دوہے دے کر سماجی نقطۂ نظر سے ان کی تشریح کی گئی ہے۔

۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی (ف جنوری ۱۹۴۸ء) نے ہندستانی پرچار سبھا قائم کی، تو ڈاکٹر جعفر حسین بھی اس کے ممبر بن گئے۔ ۱۹۴۵ء میں سبھا کی کل ہند کانفرنس وار دھا میں منعقد ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس میں شریک ہوئے اور یہاں انھوں نے ایک خصوصی نشست میں اپنا مقالہ "ہندستانی پرچار کے طریقے" پڑھا۔ گاندھی جی نے یہ مقالہ دیکھا، تو وہ اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو سبھا کی اکاڈیمک کمیٹی کا رکن مقرر کر دیا اور چندے بعد سبھا کی عاملہ میں لے لیا؛ اس کے صدر وہ خود تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کو مختلف حیثیتوں سے گاندھی جی سے ملنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کے کئی مواقع میسّر آئے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، گاندھی جی اردو ہندی کا جھگڑا ختم کرنے کے لیے ہندستانی کا چلن ضروری خیال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جعفر حسن بھی ان کے مؤید تھے۔ افسوس کہ گاندھی جی کی اچانک اور افسوسناک موت نے انھیں اپنا کام مکمّل کرنے کا موقع نہ دیا۔ لیکن ڈاکٹر جعفر حسن آخر تک انھیں اصولوں کا پرچار کرتے رہے۔

ڈاکٹر جعفر حسن اردو املا میں بھی اصلاح کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ ہم جس طرح بولتے ہیں، اسی طرح لکھیں؛ اور جن حروف کی خاص آوازیں ہم ہندستانی ادا کرنے سے قاصر ہیں، انھیں اپنے حروفِ تہجّی کی فہرست سے نکال دیں (مثلاً ح، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع) اسی اصول کے تحت وہ ہمیشہ اپنا نام جعفر حسن کی جگہ "جافر ہسن" لکھتے اور اسی طرح دستخط کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں داوِ معدولہ کا رواج بھی ترک کر دیا تھا، اور بے تکلّف خُد، خُش، خُشامد وغیرہ لکھتے تھے۔ اسی طرح "ث" اور "ص" کی جگہ صرف "س" لکھتے تھے۔ مثلاً اساسہ، مسروف۔ بلکہ اگر کوئی ان کی مانتا، تو وہ اردو کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کر لینے کے خواہشمند تھے۔

گاندھی جی کا تتبع اور مؤیّد ہونے کا ایک اور اثر یہ ہوا کہ وہ پکّے قوم پرست بن گئے (بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی اور عالمی برادری کے نظریّے کے علمبردار تھے)، وہ آخر تک کھدّر کا لباس اور گاندھی ٹوپی استعمال کرتے رہے۔ زندگی بھر شادی کا کھڑاگ پالا ہی نہیں۔ نے غمِ دزد و نے غمِ کالا۔

انھوں نے بہت کچھ لکھا۔ مطبوعہ کتابوں میں عمرانیات اور مسئلۂ تعلیم۔ ہماری ریلیں اور سڑکیں، زرعی افلاسِ ہند، سماجیات (حیدر آباد ۱۹۳۸ء)، ابتدائی عمرانیات (حیدر آباد ۱۹۴۹ء)، اطلاقی سماجیات (علی گڑھ ۱۹۵۲ء)، ہندستانی سماجیات علی گڑھ ۱۹۵۵ء) زیادہ مشہور ہوئیں۔

کئی غیر مطبوعہ کتابوں کے مکمّل مسوّدے موجود ہیں: مثلاً (۱) سماجیات کی انگریزی، اردو مرادفاتی لغت (اس میں کوئی دس ہزار انگریزی لفظوں اور اصطلاحوں کے ہم معنی لفظ۔ بیشتر اپنے وضع کردہ۔ دیے ہیں۔ اور پھر ایک آدھ فقرے میں اس کی تشریح کی ہے) (۲) تمدنیاتی اصطلاحوں کی تشریحی لغت (اس میں تقریباً دو ہزار انگریزی کی دھن کاج، راج، سماج، نفسیات وغیرہ اصطلاحوں کے لیے اردو اصطلاحیں وضع کی ہیں) (۳) انگریزی۔ ہندستانی لغت (۴) سماجیات کے اصول۔ ان کے علاوہ کئی انگریزی کی مشہور تحریروں کے ترجمے غیر مطبوعہ رہ گئے۔

ان کے شیعی پس منظر کا ثمرہ دو کتابیں ہیں "کارنامۂ انیس" اور "غالب اور انیس : ایک تقابلی مقابلہ" یہ بھی شائع نہ ہو سکیں ۔ یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے ۔ ڈاکٹر جعفر حسن کو انیس سے بہت دلچسپی تھی اور وہ تحت لفظ مرثیہ خوب پڑھتے تھے ۔ آخری زمانے میں وہ ایک "انیس کمیٹی" قائم کرنے کے بہت متمنّی تھے، لیکن افسوس کہ لوگوں کی سرد مہری کے باعث یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی ۔

بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ انھیں افسانوں اور لطیفوں سے بھی دلچسپی تھی ۔ چنانچہ انھوں نے دنیا بھر کے ملکوں کے لطیفے جمع کیے تھے (وہ لطیفے کی جگہ لفظ "مزاحیہ" لکھتے تھے) ۔ ہندستانی مزاحیے، سنساری مزاحیے، جامعی مزاحیے، لطیفوں کے مجموعے ہیں : "نئی نئی کہانیاں" اور "ان سنی کہانیاں"، افسانوں کے مجموعے ہیں ۔ کہانیاں زیادہ تر جرمن زبان سے ترجمہ کی گئی ہیں ۔ بقیہ سنے سُنائے لطیفے، حکایتیں، دلچسپ روایتیں ہیں ۔ یہ سارا ذخیرہ غیر مطبوعہ رہ گیا ۔ ان کے علاوہ ان کے مطبوعہ مضامین بھی کچھ کم نہیں ہیں، جو ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں منتشر ہیں ۔

زندگی کے آخری دو سال انتڑیوں کے کینسر سے بیمار رہے ۔ اسی سے ۲۵ جون ۱۹۷۳ء شام کے سات بجے انتقال ہو گیا ۔ جنازہ اگلے دن اٹھا، مولانا تقی حسن وفا نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور درگاہِ میر مومن، حیدرآباد میں سپردِ خاک ہوئے ۔

حمید ناگپوری، عبدالحمید

نسلاً قریشی تھے۔ دراصل ان کا خاندان حیدرآباد دکن کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے کوئی بزرگ تلاشِ معاش میں ناگپور چلے آئے تھے۔ حمید ۵ نومبر ۱۹۰۷ء کو یہیں ناگپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ رسول صاحب اپنا آبائی پیشہ قصابی کرتے اور اس سے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتے۔ لیکن حمید سات برس کے تھے کہ بدقسمتی سے ان کا انتقال ہو گیا۔ بارے، شیخ رسول کے چچازاد بھائی حاجی شیخ علی نے اس بے یار و مددگار خاندان کی دیکھ بھال اپنے ذمّہ لی۔ سنِ شعور کو پہنچے، تو والدہ نے انھیں پڑوس میں حکیم سید بہاء الدین قاری کے حوالے کر دیا، جو شیخ رسول مرحوم کے دوستوں میں سے تھے۔ ان سے اردو اور فارسی اور کچھ مذہبی کتابیں بھی پڑھیں۔ پھر چندے ایک اور بزرگ حکیم تاج محمد خان کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم ٹھیک طور پر ہوئی نہیں۔ غیر الحالی کا جو عالم تھا، اس کے باعث کسی باقاعدہ اسکول میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان اساتذہ سے جو کچھ حاصل ہو سکا، اسی پر اکتفا کرنا پڑی؛ اور وہ بھی کتنا ہوا ہو گا۔ غرض اس پہلو سے انھوں نے جو کچھ ترقی بھی کی، وہ ان کے اپنے زورِ بازو ہی کا ثمرہ تھی۔

ان کی پوری زندگی داستانِ غم ہے۔ ان سے چھوٹی ایک بہن تھیں۔ بڑی مشکلوں سے اس کی شادی کا مرحلہ طے ہوا تھا کہ وہ ایک سال بعد داغِ مفارقت دے گئیں۔ والدہ بیچاری جو پہلے ہی غموں کی ماری تھیں، بیٹی کی جوانا مرگی کا صدمہ برداشت

نہ کرسکیں، اور گھل گھل کر چند ہی دن میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ ان یکے بعد دیگرے حادثات سے حمید صاحب پر کیا بیت گئی ہوگی! لیکن قدرت نے اسی پر بس نہیں کی۔ رہی سہی کسر ایک "جذباتی حادثے" نے پوری کردی۔ اسی زمانے میں کسی کی "نگہِ التفات" ان پر پڑی۔ غریب نے خیال کیا کہ شاید زندگی بسر کرنے کو سہارا مل گیا ہے۔ لیکن وہ خاتون بھی چند دن بیمار رہ کر اچانک موت کا شکار ہو گئیں۔ اب گویا ان کی دنیا تاریک ہو گئی۔ دل میں ٹھان لی کہ ساری عمر تجرّد میں گزار دونگا۔ لیکن تابکے! دوست احباب کے کہنے سننے پر ۳۲ سال کی عمر میں ایک جگہ اپنی پسند سے نکاح کیا۔ غمگسار اور دلدار بیوی جو ملی، تو اس کی رفاقت میں وہ گزشتہ مصائب کی تلخیاں بھولنے لگے۔ لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو یہ بھی منظور نہ ہوا۔ شادی کے دوسرے ہی سال بیوی بھی (عائشہ ان کا نام تھا) خلد آشیاں ہو گئیں۔ مدّتوں اسی طرح بسر ہوئی۔ آخر بمشکل شیخ علی کے مسلسل اصرار پر وہ نکاح ثانی پر رضامند ہوئے۔ اس بیگم کے بطن سے ان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ ایک بیٹا صغر سنی میں داغ دے گیا؛ دوسرا (محمد ابراہیم) ایک نیم سرکاری دفتر میں ملازم ہے۔ لڑکیاں سب شادی شدہ اپنے گھر بار کی ہیں۔

ساری عمر ان کا ذریعۂ معاش بس اتنا رہا کہ اس سے جسم و جان کو یکجا رکھنے کا سامان پیدا ہو جاتا تھا۔ شروع میں گوشت کا آبائی کام کیا۔ پھر کوئلے کا کاروبار کرتے رہے؛ لکڑی کی ٹال بھی بنائی۔ اس سے جو آذوقہ مل گیا، صبر و شکر سے اس پر قانع رہے۔ لیکن ۱۹۶۴ء میں فالج کا حملہ ہوا اور وہ نقل و حرکت سے معذور ہو گئے۔ دکان کی دیکھ بھال کون کرتا! آخر ان کے احباب نے ہاتھ پانوٗ مارے اور مہاراشٹر حکومت کو توجہ دلائی، جہاں سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں پچاس روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر ہو گیا، جو تادمِ مرگ ملتا رہا۔

فالج کا مستقل عارضہ تو تھا ہی، آخری چند ماہ میں اس پر سوزشِ بول کے موذی مرض کی مصیبت مستزاد ہو گئی۔ یکم جولائی ۱۹۷۳ء سے طبیعت بگڑنا شروع ہوئی۔

جمعہ ۶ جولائی ۱۹۷۳ء علی الصباح پانچ بجے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اسی دن بعدِ نمازِ جمعہ قبرستانِ مومن پورہ، ناگپور میں آخری خوابگاہ میں پہنچا دیے گئے۔

حمید صاحب نے طبیعت حسّاس پائی تھی۔ گھر کے جو حالات تھے، وہ تو ظاہر ہی ہیں۔ ان پر مصائب نے انھیں پکّا پھوڑا بنا دیا تھا۔ نالے شعر کی شکل اختیار کر گئے۔ وہ تقریباً ۲۰ برس کے سن میں شعر کہنے لگے تھے۔ چندے منشی نواب خان نواب ہندی الٰہ آبادی سے مشورہ کیا تھا؛ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن قائم نہیں رہا۔ نواب ریلوے کے ڈاکخانے میں ملازم تھے۔ جب وہ تبادلے پر ناگپور آئے، تو حمید ان کی خدمت میں جانے لگے۔ لیکن اس کے جلد بعد ہی وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ناگپور سے چلے گئے، اور اصلاح کا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد اپنی خداداد ذہانت اور طبعِ موزوں کی رہنمائی میں خود ہی اپنے کلام کی نوک پلک درست کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ سب نے ان کی مہارتِ سخن تسلیم کر لی۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ سیّد ابو الحسن ناطق گلاؤٹھوی (ف ۱۹۶۹ء) نے جو کسی کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے ان کے کلام کی یوں تعریف کی ہے:

> ہمیشہ ہی ان کا جو کلام میں نے سنا، اسے محاسنِ لفظی و معنوی سے پُر پایا۔ اسی لیے میری دلبستگی حمید صاحب سے بڑھتی ہی چلی گئی چنانچہ اب تو یہ عالم ہے کہ جہاں شرکتِ مشاعرہ کے لیے جانے کا ارادہ کرتا ہوں، وہاں منتظمین مشاعرہ پر حمید صاحب کو بلانے کی شرط لگا دیتا ہوں۔ اور جب جاتا ہوں، تو میری آنکھیں انھیں تلاش کرتی ہیں۔

ان کے کلام کا مختصر انتخاب "حرفِ خاموش" کے عنوان سے "اپنا کتاب گھر"، کامٹی (مدھیہ پردیش) نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں غزلیں، نظمیں، قطعات وغیرہ ہر طرح کا کلام ہے۔ ہنوز بہت کلام مسوّدوں کی شکل میں پڑا ہے۔ ان کے اشعار پڑھ کر ہرگز یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ کسی کم تعلیم یافتہ شخص کا کلام ہے؛ ایک ایک

مصرع سے پختگیِ فن اور قدرتِ زبان کا ثبوت ملتا ہے۔

جہاں چھوڑا تھا تم نے وقتِ رخصت وہیں ٹھہرا رہا میرا زمانہ

خرابِ زیست ہوں، لیکن تری خوشی کے سوا ترے نثار، مجھے زندگی سے کیا لینا!
حمید! اصل میں اک غم کو ہے ثبات یہاں جسے دوام نہیں، اس خوشی سے کیا لینا!

ان کی خاموشی بھی افسانہ در افسانہ بنی ہم نے جو بات کہی، بات سے آگے نہ بڑھی
عشق ہر مرحلۂ غم کی حدیں توڑ چکا عقل اندیشۂ حالات سے آگے نہ بڑھی
نگہِ دوست میں توقیر نہیں اس کی، حمیدا وہ تمنا جو مناجات سے آگے نہ بڑھی

تری یاد اور شامِ غم کی اداسی دیا جیسے جنگل میں کوئی جلائے

حُسنِ خوددار اُدھر، عشقِ خود آگاہ اِدھر نہ خبر آتی ہے کوئی، نہ خبر جاتی ہے
غم کے اشکوں سے جِلا پاتا ہے انساں کا ضمیر زندگی درد و مصائب میں نکھر جاتی ہے
اُف، یہ عالم کہ ترا نام بھی لیتا ہے کوئی دل پہ افتاد سی افتاد گزر جاتی ہے!

رزمگاہِ حیات میں، جیت کہاں کی، ہار کیا!
چاہیے جرأتِ عمل، فکر و زیانِ کار کیا!
سوز و گدازِ عشق سے دل جو ہو لطف آشنا
جنّتِ قربِ یار کیا، دوزخِ انتظار کیا!

صیّاد کے ستم کا، احسان حمید! مانو کنجِ قفس میں چھوٹے، تم فکرِ آشیاں سے

یہ طوفانِ بلا تقدیر سازِ اہلِ ہمّت ہے
کوئی حق آشنا کہہ دے، سبکسارانِ ساحل سے
حمیدا اس دَور میں آسائشِ ہستی کسے حاصل!
سکونِ زندگی ناپید ہے انسان کے دل سے

یہ مانا، عبادت میں ہے لطف، زاہد! خطا کاریاں، پھر خطا کاریاں ہیں

شرمائی نظر، اور پسینہ یہ جبیں پر
مجبور نہ کر، اپنی محبت کے یقیں پر

نہ وہ دورِ بادۂ شوق ہے، نہ وہ تلخیِ غمِ یار ہے
مرا حالِ زار نہ پوچھیے؛ نہ سکون ہے نہ قرار ہے
جو پیامِ دوست نہ لا سکے جو کلی نہ دل کی کھلا سکے
وہ نسیم کوئی نسیم ہے، وہ بہار کوئی بہار ہے

دل میں ہے وہی حسرتِ اظہارِ محبت ہم نے یہ کہانی انھیں سو بار سنا دی
آگ یہ کیسی چمن میں ہے؟ ہمصفیرو! دیکھنا بجلیوں کی زد میں کس کا آشیانہ آگیا
شبِ وعدہ تو کچھ رونق در و دیوار پر ہوتی نہیں معلوم آخر کیوں یہ ویرانی نہیں جاتی
نگاہِ آشنا سے شکوۂ بیگانگی کیسا! محبت کی نظر بھی تم سے پہچانی نہیں جاتی

کیا عشق میں فطرت بھی بدل جاتی ہے دل کی
تکلیف میں آرام ہے، معلوم نہیں، کیوں!

مہاتما گاندھی

مردِ حق آگاہ گاندھی، ملک و ملّت کا وقار
جس کی پیشانی کی منت کش، کلاہِ افتخار
انقلابِ دہر کو ٹھوکر کا جس کی انتظار
جو سمندِ وقت کا رُخ موڑ دے، وہ شہسوار

دبدبے سے جس کے دشمن لرزہ براندام تھا
امن و آزادی کا دنیا کے لیے پیغام تھا

ہیچ تھا جس کی نظر میں رنگ و خوں کا امتیاز
جس کی فطرت بھی نزاعِ کفر و دیں سے بے نیاز
صاحبِ علم و فراست، نیک طینت، پاکباز
نوعِ انسانی کو جس کی ذات پر تھا فخر و ناز

جس کا مذہب آدمیت کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جس کے سینے میں محبت کے سوا کچھ بھی نہ تھا

کھول دے تقدیر کے بل جس کے ماتھے کی شکن
آنکھ سورج سے ملا سکتا تھا جس کا بانکپن
سوزِ حُرّیت سے جس کا ہر نفس تھا شعلہ زن
مسکراتی تھی لبوں پر جس کے نصرت کی کرن

جذبۂ فکر و عمل سے جس کا دل بیدار تھا
وہ مجاہد جو اہنسا کا علمبردار تھا

سرنگوں تھا جس کے قدموں پر فرنگی سامراج
رکھ دیا بھارت کے سر پر جس نے آزادی کا تاج
امن و آزادیِ عالم کو تھی جس کی احتیاج
پیش کرنا ہے ہمیں جس کو عقیدت کا خراج

مادرِ ہندوستان کی شان و عظمت کی قسم
امتیازِ قوم و ملّت کو مٹا ڈالینگے ہم

ضیا بدایونی، ضیا احمد، پروفیسر

یوپی کا تاریخی شہر بدایوں کسی تفصیلی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ یہ صدیوں تک علم و فضل اور رُشد و ہدایت کا مرکز رہا ہے اور اسے اسلامی عہد کی بیحد برگزیدہ شخصیتوں کی جنم بھوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آغاز میں حضرت محمد بن ابوبکر صدیق کی نسل سے ایک صاحبِ علم بزرگ مولانا وجیہہ الدین اپنے خاندان سمیت سنبھل سے بدایوں آئے، اور یہاں مولوی ٹولہ میں بس گئے۔ انھیں اسلاف میں کمال احمد صاحب ہوئے ہیں، جن کی فارسی ادبیات اور خطاطی میں مہارت بدایوں کے اہلِ علم حلقوں میں آج بھی یاد کی جاتی ہے۔ ان کے تین بیٹے ہوئے: بڑے، شفیع احمد محو شاگردِ امیر مینائی (ف اکتوبر ۱۹۰۰ء)؛ منجھلے، رفیع احمد عالی شاگردِ تسلیم لکھنوی (ف مئی ۱۹۱۱ء) اور مطیع احمد رخشاں شاگردِ راشد علی ضیا و منیر۔ رفیع احمد عالی وکیلِ عدالت تھے؛ اس حیثیت سے مدّتوں ضلع بدایوں کی تحصیل گنوّر میں مقیم رہے۔ وہ اپنے والد کی طرح فارسی کے فاضل، اور اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا۔

رفیع احمد عالی کی اولاد میں تین بیٹیوں کے علاوہ تین بیٹے ہوئے: رضی احمد رضی اور ضیا احمد ضیا اور آفتاب احمد جوہر۔ رضی احمد پولیس کے محکمے میں انسپکٹر تھے۔ ان کے کلام کا ایک مختصر انتخاب "لمعات" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (علی گڑھ) انھوں نے ۱۹۳۹ء میں رحلت کی۔ چھوٹے بھائی آفتاب احمد ڈسٹرکٹ جج کے عہدے سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔ بفضلہ خوش و خرّم بدایوں میں قیام ہے۔

ضیا احمد بروزِ جمعہ ۲۰ ربیع الاوّل ۱۳۱۲ھ (۲۱ ستمبر ۱۸۹۴ء) کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ پہلے دن سے توام کے کمزور اور منحنی تھے؛ اسی باعث اکثر بیمار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسے بیمار ہوئے کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ نانی نے منّت مانی کہ بچّہ ٹھیک ہو گیا، تو میں اسے عربی پڑھا کر عالم و خادمِ دین بناؤنگی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ کہ وہ بچّہ جو ہر طرح کے علاج معالجے سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، اس دعا کے بعد ایک معمولی عطار کے ٹوٹکے سے تندرست ہو گیا۔

جب سنِ شعور کو پہنچے، تو نانی اماں کی منّت کے احترام میں بدایوں کے مشہور مدرسے شمس العلوم میں بھیج دیے گئے، جہاں کا نصاب درسِ نظامی پر مشتمل تھا۔ انھوں نے یہاں مولانا محب احمد قادری، مولانا محمد ابراہیم قادری اور مولانا شاہ عبد المقتدر (سجّادہ نشینِ درگاہِ قادریہ) سے عربی پڑھی۔ عربی کے علاوہ اس مدرسے میں فارسی اور قرآن کی تعلیم پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر انھوں نے حدیث کی سند اور اجازت مولانا سیّد یونس علی محدّث بدایونی سے لی۔

شمس العلوم میں درسِ نظامی کی تکمیل تو ہو گئی؛ لیکن چونکہ وہ انگریزی سے بالکل نابلد تھے، اس لیے ان کے والد نے اب انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول، بدایوں میں بھیج دیا۔ یہاں دسویں درجے تک تعلیم پانے کے بعد انھوں نے بریلی کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی اے کی سند حاصل کی، اور طلائی تمغہ انعام میں پایا۔ اس کے بعد چندے ملازمت کی اور بالآخر ۱۹۲۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ اب انھوں نے ڈاکٹر زبید احمد صدر شعبۂ فارسی کی نگرانی میں "فارسی ادب در عہدِ اکبر" کے موضوع پر مقالہ مرتب کرنے کی تیاری شروع کی۔ لیکن ہنوز کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ انٹرمیڈیٹ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جگہ مل گئی اور یہ مقالے سے دست بردار ہو کر علی گڑھ چلے آئے۔ دو برس بعد ۱۹۲۹ء میں وہ دلّی کالج، دلّی میں بھی کوئی سال بھر تک ملازم رہے۔ لیکن جلد ہی یہاں سے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں مدرّس (لکچرر) بن کر علی گڑھ واپس

چلے گئے۔ اصحابِ حل وعقد نے محسوس کیا کہ اپنی تعلیم کے پیشِ نظر یہ اردو کی بجائے فارسی کے شعبے کے لیے زیادہ موزوں رہیں گے، چنانچہ ان کا تبادلہ شعبۂ فارسی میں ہوگیا۔ وہ یہاں ۱۹۵۹ء تک رہے۔ پہلے مدتوں ریڈر کی حیثیت سے کام کیا؛ ۱۹۵۹ء میں سبکدوشی سے کچھ پہلے پروفیسر اور صدرِ شعبہ بنا دیے گئے تھے۔

ملازمت سے الگ ہونے پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے انھیں امیر خسرو پر تحقیقی کام کے لیے وظیفہ دیا۔ ۱۹۶۲ء میں وہ انجمن ترقی اردو (ہند) میں اردو لغت کی ترتیب و تدوین کے کام پر مقرر ہو گئے۔ سال بھر بعد یعنی ۱۹۶۳ء میں دلّی یونیورسٹی نے انھیں اسی کام پر اپنے ہاں بلا لیا۔ یہاں وہ ۱۹۷۱ء تک رہے چونکہ اب بیمار بہت رہنے لگے تھے، خاص طور پر فشارِ دم کا پرانا عارضہ عود کر آیا تھا، اس لیے وہ میعاد ختم ہونے پر الگ ہو گئے۔ اس کے بعد بھی ان کا زیادہ قیام دلّی میں اپنے بیٹے ڈاکٹر ظہیر احمد صدّیقی کے ساتھ رہا، اگرچہ علی گڑھ جاتے آتے رہتے تھے۔ علی گڑھ ہی میں تھے کہ ۴ جولائی ۱۹۷۳ء کو انھیں فشارِ دم کے شدید حملے سے چکّر آیا۔ ڈاکٹر نے پورے آرام کا مشورہ دیا۔ جب حالت اور خراب ہوگئی، تو اگلے دن (۵ جولائی) غفلت اور نیم بیہوشی کی حالت میں انھیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ تین دن تک یہی صورتِ حال رہی۔ ۸ جولائی ۱۹۷۳ء علی الصباح تین بجے روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اسی دن دوپہر کے وقت تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور انھیں یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ گویا علم و فضل کا وقار، شرافت و وضعداری، انکساری و خرد نوازی دفن ہوگئیں۔ جناب اظہر احمد کمالی کے قطعۂ تاریخِ وفات کا مقطع ہے:

از سرِ اندوہ تربت پر لکھوں سالِ وفات
تاجدارِ علم و حکمت، بادشاہِ فکر و فن
(۱+ ۱۹۷۲ = ۱۹۷۳ء)

ان کا نکاح غالباً ۱۹۰۹ء میں بدایوں کے قدیم قاضیوں کے خاندان میں قاضی منظور حسین

وکیل کی چھوٹی صاحبزادی شکیلہ خاتون سے ہوا تھا۔ ان سے ایک بیٹی (بلقیس خاتون) اور پانچ بیٹے (حبیب احمد، رفیق احمد میکش، ظہیر احمد صدیقی، نصیر احمد صدیقی، معین احمد صدیقی) اپنی یادگار چھوڑے۔ سب بیٹے برسرِ روزگار اور خوش و خرّم ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ایم اے، پی ایچ ڈی دلّی یونیورسٹی میں ریڈر اور صدر شعبۂ اردو ہیں۔

ضیا صاحب نے شعرگوئی اپنے اسکول کے زمانے میں شروع کی۔ شروع میں غزل کی طرف زیادہ میلان رہا۔ لیکن اکبر الٰہ آبادی سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے مشورہ دیا کہ غزل گوئی بیکاری کا مشغلہ ہے؛ اس سے بہتر ہے کہ مولانا شبلی نعمانی (ف نومبر ۱۹۱۴ء) کی طرح تاریخِ اسلام کے مشہور اور سبق آموز واقعات کو نظم کیا جائے۔ چنانچہ ان کا اس سے بعد کا کلام بیشتر اسی رنگ کی منظومات پر مشتمل ہے۔

باقاعدہ تلمّذ کا تعلق کسی سے نہیں رہا۔ کبھی ضرورت پڑی، تو اپنے بڑے بھائی رضی بدایونی سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔

حسبِ ذیل تصنیفات ان سے یادگار ہیں:

(۱) قصائدِ مومن مع شرح (لکھنؤ ۱۹۲۵ء)؛ (۲) دیوانِ مومن مع شرح (الٰہ آباد ۱۹۳۴ء) بعد کو اس کے دو اور ایڈیشن شائع ہوئے (۱۹۴۷ء، ۱۹۵۷ء)؛ (۳) تذکارِ سلف (تاریخی منظومات کا انتخاب)؛ (۴) کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟ (علی گڑھ ۱۹۴۸ء)؛ (۵) تجلیات (مجموعۂ نظم) (دلّی ۱۹۵۳ء)؛ (۶) یادگارِ عالی (بدایوں) اس میں اپنے والد مرحوم کا کلام مع مقدمہ شائع کیا ہے؛ (۷) لمعات (علی گڑھ) اس میں اپنے برادرِ اکبر رضی بدایونی کا کلام جمع کیا ہے؛ (۸) قولِ سدید (علی گڑھ ۱۹۶۰ء) یہ محمود احمد عباسی امروہوی کی کتاب "خلافتِ معاویہ ویزید" کا جواب ہے؛ (۹) مکتوبات (دلّی ۱۹۶۷ء) ان خطوط کا انتخاب جو دوسرے حضرات نے ان کے نام لکھے تھے؛ (۱۰) سمن زار (ساہتیہ اکاڈیمی، نئی دلّی ۱۹۶۸ء) فارسی شاعری کا انتخاب مع اردو ترجمہ؛ (۱۱) مباحث و رسائل (دلّی ۱۹۷۱ء) علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ؛ اس پر یوپی اردو اکاڈمی نے دو ہزار روپے کا انعام دیا تھا؛ (۱۲) جلوۂ حقیقت (دلّی ۱۹۷۲ء)؛ مذہبی مضامین کا مجموعہ؛

(۱۳) مسالک و منازل (دلّی ۱۹۷۵ء)؛ فارسی مقالات ادبی و انتقادی۔ کچھ چیزیں، خاص کر دیوان کا بیشتر حصّہ، غیر مطبوعہ رہ گیا۔
پورے کلام کا مجموعہ نہیں چھپا۔ ضخیم کلیات یادگار چھوڑا ہے۔ زمانے کی روش بدل گئی، اب اس کے چھپنے کی کیا توقع ہے! اسی سے مختلف اصنافِ سخن کا انتخاب پیش کر رہا ہوں:۔

اسلام اور غلامی

اس عہدِ معدلت کا یہ قصہ ہے جب کہ تھا
کوفہ علیؓ کے ظلّ ہمایوں سے فیضیاب
وہ بادشاہ، نانِ جویں جس کا ناشتا
وہ شہریار، فرشِ زمیں جس کا رختِ خواب
جس کی زبان محفلِ حکمت میں دُر فشاں
جس کی حسام شورشِ ہیجا میں فتحیاب
حاصل تھا یہ اسی کو تقرّب کر، پیار سے
کہتے تھے بُوتراب، رسولِ فلک جناب
بازار ایک روز گئے، عید کے قریب
قنبر غلام خاص تھے حیدر کے ہم رکاب
دونوں کے پیرہن تھے زلبس کہنہ و ردی
دو کپڑے اس جگہ کیے مولا نے انتخاب
ایک ان میں نسبتہً تھا نفیس اور قیمتی
اور دوسرا تھا نرخ میں کم ارز اور خراب
اچھا جو تھا، وہ اُن کو دیا، خود بُرا لیا
ہر دم تھا بسکہ پیشِ نظر جادۂ صواب
قنبر نے عرض کی کہ جو بہتر لباس ہے
بہرِ نمازِ عید کریں زیبِ تن جناب
اصرار انتہا سے بڑھا جب رفیق کا
بولے کمالِ لطف و کرم سے یہ بُوتراب
تم ہو ابھی جواں، ہے تجمّل روا تمھیں
میں پیر ہوں، بجا ہے تجمل سے اجتناب
چھیڑا نہ خواجگی و غلامی کا تذکرہ
مطلب یہ تھا کہ آئے نہ اس سے انھیں حجاب

محسنِ اسلام
(گاندھی جی)

اے وہ کہ تو نے جاں سی متاعِ عزیز کو
آزادیِ ضمیر پہ قربان کر دیا
اے وہ کہ تیرے خون کی ہر ایک بوند نے
ہندوستاں میں امن سامان کر دیا
اے وہ کہ تو نے معشرِ اسلام کے لیے
دشواریِ حیات کو آسان کر دیا

تیرے ہر ایک قطرۂ خون نے جہان میں — برپا سرشکِ درد کا طوفان کر دیا
تھی تیرے دم سے پیکرِ مہر و وفا میں جان — قاتل نے کیا کیا، تجھے بیجان کر دیا
حصنِ ودادِ ہندو و مسلم تھی تیری ذات — ہیہات! ظلم نے اسے ویران کر دیا
کیا نشۂ شرابِ تعصب تھا، جس نے، آہ — انساں کو اس دیار میں حیوان کر دیا
"ہے چست حریت کی قبا تن پہ ہند کے" — اس ستم شعار نے بطلان کر دیا
بھارت کو تھی دنوں سے بلیدان کی طلب — جاں دے کے تو نے پیش بلیدان کر دیا
"مسلم کو بھی ہے جینے کا حق خاکِ ہند میں" — تو نے دہانِ زخم سے اعلان کر دیا
پھونکوں سے شمعِ دیں کو بجھانے چلے تھے جو — اس سعیِ بد پہ ان کو پشیمان کر دیا
چھایا تھا مسجدوں کی فضا پر جو ابرِ جور — وہ تو نے ایک دم میں پریشان کر دیا
بھولینگے اب نہ اہلِ وفا جس کو حشر تک — وہ امّتِ رسول پہ احسان کر دیا

زیبا ہے تجھکو "محسنِ اسلام" کا لقب
حق نے یہ مرتبہ تجھے پہچان کر دیا

مرحوم کو تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ بیمحل نہیں ہو گا، اگر ان میں سے چند محفوظ کر دی جائیں [۵]:

تاریخِ وفات سیّد نظام الدّین شاہ دلگیر اکبرآبادی:

گئے خرابۂ ہستی سے حضرتِ دلگیر — نصیب گلشنِ فردوس میں قیام ہوا
جو گوش زد ہوا یہ حالِ غم مآل، ضیا! — تو فکر سال کا منظور اہتمام ہوا
کہا زرُدے جملِ یوں خرد نے سالِ وفات — کہ ملکِ علم و ادب، حیف بے نظام ہوا

(۳ + ۱۳۵۰ = ۱۳۵۳)

بوفاتِ فاضلِ مبرور، شاعرِ مشہور حضرت احسن مارہروی مغفور: ۱۳۵۹ھ

وہ جناب احسنِ مارہروی — خدمتِ شعر و ادب تھا جن کا کام
یاد آئینگی جب ان کی صحبتیں — تڑپیگا سینے میں قلبِ مستہام

[۵] ہر ایک تاریخ کے ساتھ خاصا طویل قطعہ ہے؛ میں نے صرف چند اشعار انتخاب کر لیے ہیں۔

عرض ہے حق سے کہ ان کی قبر پر — بارشِ بارانِ رحمت ہو مدام
ہے ضیا! گر فکرِ تاریخِ وفات — لکھ: "وصالِ شاعرِ شیریں کلام"

(۱۳۵۹)

تاریخِ رحلتِ حضرت اخی واستاذی مولوی حاجی رضی احمد صاحب رضیؔ:

ہے حادثۂ سخت بڑے بھائی کی رحلت — تفصیل کا یارا ہے زباں میں، نہ قلم میں
یاد آتے ہیں جب ان کے وہ الطافِ فراواں — بندھ جاتی ہے اشکوں کی جھڑی جوشِ الم میں
مجھ کو بھی فنِ شعر میں خامی کا ہے رونا — حالیؔ کی طرح حضرتِ استاد کے غم میں
تاریخ بھی رحلت کی، ضیا! ہے یہ دعا بھی — "مہمان ہوں، وہ دارِ چمنستانِ ارم میں"

(۱۳۵۸)

حبّی ومحبّی فاضلِ نبیل مولوی یعقوب بخش راغب بدایونی:

وہ راغب، وہ عزیزِ مصرِ معنی — نہیں جن کا بدل ہندوستاں میں
ضیا! کہہ مصرعِ تاریخِ رحلت — یہ فرمائش تھی بزمِ دوستاں میں
جو نکلا مادّہ میں نے سنایا — "گئے راغب گلستانِ جناں میں"

۵۰ — (۱۹۹۸-۵۰ = ۱۹۴۸ء)

جناب مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی:

عالمِ دیں، حضرتِ عبدالقدیر — ذی الفضائل، ذی کرم، ذی مرتبت
آہ رخصت ہو گئے شوال میں — اس جہاں سے سوئے دارِ آخرت
ہے دعا، یارب! ہو ان کے زیبِ فرق — تاجِ گلہائے ریاضِ مغفرت
کر رقم تاریخ اس غم کی، ضیا! — "انتقالِ عالمِ نیکو صفت"

(۱۳۷۹)

تاریخِ وفات ڈاکٹر ہادی حسن:

فاضلِ شیریں بیاں ہادی حسن — ناگہاں دوش از قضا خاموش شد
بود ذاتش شمعِ ایوانِ کمال — حیف، از بادِ فنا خاموش شد

گفتمش سال از سرِ حسن و الم — "طوطیِ گویائے ماخاموش شد"
(۵ + ۱
(۱۳۸۲ = ۱۳۷۳ *

غرض کتنی تاریخیں نقل کروں - ان کی بیاض میں بے مبالغہ سینکڑوں تاریخیں ہیں - دوستوں کے ہاں ولادت، شادی، غمی کی؛ کسی کے تحفے کی رسید؛ کسی کی کتاب کی طباعت کی، ہر طرح کی تاریخیں ہیں - مرحوم مجھ پر بہت کرم فرماتے تھے - ان میں دو تاریخیں میرے متعلق بھی ہیں؛ انھیں شامل انتخاب کر رہا ہوں تاکہ یادگار رہیں۔

۱۹۶۵ء میں ہماری چھوٹی بیٹی بشریٰ کی شادی ہوئی، تو انھوں نے تاریخ کہی:

تاریخِ عقدِ بشریٰ دخترِ مالک رام صاحب:

حبذا طوبیٰ ہمایونے کز آں — ہر غم است اندر ہجومِ عیش گم
بہرِ تاریخش خرد نوشاہ را — گفت: "واللہ ہاذہٖ بشریٰ لکم"
(۱۳۸۵)

۱۹۷۱ء میں میرے لیے احباب نے تین جلد (اردو اور انگریزی) میں ایک اعزازی کتاب مرتب کی، جسے راشٹرپتی شری وی، وی، گری بالقابہ نے ایک خاص تقریب میں، جو راشٹرپتی بھون میں منعقد ہوئی تھی، مجھے پیش کیا - اس موقع پر مرحوم نے تاریخ کہی:

قطعۂ تاریخ نگاہ داریِ "جشنِ مالک رام" بخدمتِ فاضلِ موصوف:

زہے مہرِ سپہرِ علم مالک — نگہ دارد حق از بیمِ زوالش
خجستہ "ارمغانے"[1] کہ اینک آمد — دلیلِ تازہ بر اوجِ کمالش
ہوا خواہاں زبس دلشاد گشتند — بہ تشریفے کہ دادہ ذوالجلالش
بمن گفتہ سروش "از روئے الہام — "ہمایوں بخت، روشن فکر" سالش
(۱ +
(۱۹۷۱ = ۱۹۷۰

اب آخر میں چند شعر غزل کے بھی ملاحظہ ہوں:

صدقے، اے عشقِ تصوّر! تری رنگینی کے — خلد نظارہ ہے گوشہ مری تنہائی کا

---

[1] اشارہ بہ کتاب "ارمغانِ مالک" (ضیا)

حُسنِ فطرت کا بہر رنگ نمایاں ہونا　　کبھی سبزہ، تو کبھی گلِ خنداں ہونا
حُسن پھر حُسن ہی ہے، لاکھ خطا وار سہی　　مجھ سے دیکھا نہ گیا ان کا پشیماں ہونا

میں ہوں، اندوہ ہے، اور گوشۂ تنہائی ہے　　وہ ہیں، اغیار ہیں، اور انجمن آرائی ہے

تمنّا کا فنا ہونا، ہے بر آنا تمنّا کا　　مجھے مشکورِ سعیِ بے اثر معلوم ہوتی ہے
کہاں تھی دلکشی یہ جلوۂ حُسنِ خود آرا میں　　مری رنگینیِ ذوقِ نظر معلوم ہوتی ہے
نہیں کم مرگِ حسرت بھی حیاتِ تلخکامی سے　　وہ تھی دشوار، یہ دشوار تر معلوم ہوتی ہے
جنونِ سجدۂ پیہم کا اعجاز، اے ضیا! دیکھو　　جبینِ شوق جُزوِ سنگِ در معلوم ہوتی ہے

انوارِ تجلّی کی، اللہ رے، نظر سوزی　　بے پردہ ہیں اور پردہ ہے چشمِ تماشا سے
یہ کشمکشِ ہستی سرمایۂ ہستی ہے　　موجوں نے کہا بڑھ کر یوں ساحلِ دریا سے
وہ سامنے ہیں پھر بھی محرومِ تجلّی ہوں　　تصویرِ تحیّر ہوں، نیرنگِ تماشا سے

ہے وہی طور، وہی برقِ تجلّی، لیکن　　دشتِ ایمن میں نہیں موسیٰ عمراں کوئی
اب نہ وہ رنگ ہے غنچوں میں، نہ بو پھولوں میں　　لے گیا ساتھ بہارِ چمنستاں کوئی

کھل ہی گیا سب رازِ دل ان کا　　چشمِ سخن آرا کی زبانی
جان کی قیمت عشق کی عظمت　　میں نے نہ سمجھی، تم نے نہ جانی

سجّاد ظہیر، سیّد

ان کا خاندان ضلع جونپور (یوپی) کے چھوٹے سے گانو کلاں پور کا رہنے والا تھا۔ یہ لوگ دراصل زمیندار تھے، اگرچہ انھوں نے ملازمت شروع کر دی تھی۔ چنانچہ سجّاد ظہیر کے دادا سیّد ظہیر حسن صاحب تحصیلدار تھے، اور والد سر سیّد وزیر حسن اپنے زمانے کے کامیاب ترین وکلا میں سے تھے۔ سیّد وزیر حسن نے شروع میں چندے پرتاپ گڑھ میں وکالت کی اور اس کے بعد لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ وہ ملکی سیاست میں بھی بہت سرگرم تھے، بہت دن تک آل انڈیا مسلم لیگ کے سکتر رہے۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ کا جو سیاسی سمجھوتہ لکھنؤ میں ہوا تھا، اس میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ رفتہ رفتہ وہ پہلے اودھ چیف کورٹ میں جج مقرر ہوئے اور بعد کو اس کے چیف جج بن گئے۔

سیّد وزیر حسن کا پڑوس کے دیہات بڑا گاؤں کے ایک اور زمیندار کی صاحبزادی سکینۃ الفاطمہ بیگم (عرف سُکّن بی بی) سے نکاح ہوا تھا۔ ان کی اولاد میں پانچ صاحبزادے ہوئے، علی ظہیر، حسن ظہیر، حسین ظہیر، سجّاد ظہیر، باقر ظہیر۔ بفضلہ تعالیٰ سب نے اپنے اپنے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

سیّد سجّاد ظہیر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عام طور پر ان کی تاریخِ ولادت ۵ نومبر ۱۹۰۵ء لکھی گئی ہے۔ اس میں مہینا اور دن تو درست ہیں، لیکن سال ٹھیک نہیں؛ ۱۹۰۵ء کی جگہ ۱۹۰۴ء چاہیے۔ میں نے ایک دن خود ان ہی سے اس معلومِ عوام تاریخ کی تصدیق چاہی، تو کہنے لگے کہ سرکاری کاغذوں میں یہی تاریخ لکھی ہے؛ لیکن ہوا یہ کہ جس دن بابا (والد) مجھے اسکول میں داخل کرانے کو لے جا رہے

تھے، بوبو (والدہ) نے ان سے پوچھا: اس کی پیدائش کی تاریخ کیا لکھواؤ گے؟ بابا نے جواب دیا، جو ٹھیک تاریخ ہے، وہی لکھواؤنگا۔ اس پر بوبو نے کہا: ایک سال کم لکھوا دیتا۔ بابا نے فرمایا: بہت اچھا، یہی کردونگا۔ چنانچہ انھوں نے تاریخِ ولادت ۵ نومبر ۱۹۰۴ء کی بجائے ۵ نومبر ۱۹۰۵ء درج کرادی؛ اور یہی مشہور ہوگئی۔

سجّاد ظہیر کی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں اپنے بڑے بھائیوں کی طرح یہ بھی آکسفرڈ بھیج دیے گئے۔ سیّد وزیر حسن چاہتے تھے کہ سجّاد ظہیر آکسفرڈ یونیورسٹی سے بی اے (آنرز) کی سند لیں اور انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کرکے بڑے افسر بنیں اور یوں ان کے خیال میں، کامیاب زندگی بسر کریں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب ہوا، جس نے صدیوں کی زارشاہی کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اس واقعے نے بین الاقوامی سیاست میں بلا مبالغہ زلزلے کا کام کیا۔ جہاں بادشاہوں اور سرمایہ داروں اور نوکرشاہی نے اسے اپنے اقتدار کے لیے فالِ بدخیال کیا، وہیں عوام نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ بیشتر ملکوں میں اس انقلاب کی یادگار کے طور پر اکتوبر کلب قائم ہوئے، جن میں نوجوان جوق در جوق شامل ہونے لگے۔ ایسا ہی ایک کلب آکسفرڈ میں تھا۔ سجّاد ظہیر بھی اس کے رکن بن گئے۔

سجّاد ظہیر اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں شروع سے باغیانہ خیالات کے تھے۔ وہ جوبلی ہائی اسکول کے دسویں درجے میں پڑھتے تھے؛ یہی پندرہ سولہ برس کا سن ہوگا، جب ۱۹۱۹ء میں ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ سجّاد ظہیر پر ان کا بہت اثر ہوا۔ اگرچہ اپنے خاندانی ماحول کے پیشِ نظر ان سے برملا اپنی ہمدردی یا انگریز کی مخالفت کا اظہار تو نہیں کرسکتے تھے، لیکن عنفوانِ شباب میں حکومت بیزاری کا جو جذبہ ان کے دل و دماغ میں پیدا ہوا تھا، وہ مرورِ زمانہ کے ساتھ نشوونما پاتا رہا، اور جب انھیں آکسفرڈ میں آزاد فضا میسّر آئی، تو وہ

برگ وبار لے آیا۔ آکسفرڈ کلب میں کس قسم کی گفتگو ہوگی، وہاں کون لوگ کیسی تقریریں کرتے ہونگے، اس سب کا آسانی سے تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر میں سجّاد ظہیر نے اپنے والد کی خدمت میں لکھ دیا کہ میں آئی۔سی۔ایس نہیں بننا چاہتا۔ سیّد وزیر حسن صاحب نے اس پر بادلِ ناخواستہ رضامندی کا اظہار کردیا اور کہا کہ اچھا بیرسٹری کا امتحان پاس کرلو۔ سجّاد ظہیر بیرسٹری کے بھی حق میں نہیں تھے، وہ اپنے مستقبل کا کچھ اور لائحۂ عمل بنا چکے تھے، جس میں وکالت کی کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن اب انھوں نے دوبارہ والد کو لکھنا مناسب خیال نہ کیا۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۳۶ء میں وطن واپس آئے ہیں، تو بی۔اے (آکسفرڈ) بھی تھے اور بیرسٹر بھی؛ لیکن اس کے ساتھ وہ پکے "کمیونسٹ" بھی تھے۔

ہندستان واپس آنے کے بعد انھوں نے ادبی اور سیاسی دونوں محاذوں پر کام شروع کیا۔ وہ اپنی تعلیم کے دوران (۱۹۳۱ء) میں کوئی چھ مہینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے یہاں سے افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے" کے نام سے چھاپا۔ اس میں کل دس افسانے تھے، پانچ خود ان کے، دو احمد علی کے، ایک افسانہ اور ایک ڈرامہ رشید جہاں کا، اور ایک محمود الظفر کا۔ ان سب افسانوں کا معیار کسی طرح بھی بلند نہیں کہا جاسکتا؛ یہ زبان اور بیان کی خامیوں سے بھی مبرّا نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے ہماری افسانہ نگاری کو ایک طرح سے نیا رُخ ملا۔ ان میں سماجی اور مذہبی مسائل پر جس بیباکی اور صاف گوئی، بلکہ کہیں کہیں عریانی سے اظہارِ خیال کیا گیا تھا، وہ ہمارے ادب میں بالکل نئی چیز تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ولایت میں لارنس، جوائس، فرانک ہیرس، فرائڈ وغیرہ کی کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہی تھیں، جن کی تقلید میں انھوں نے یہ افسانے لکھے اور طبع کرائے۔ بہرحال ان کا یہ تجربہ بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ بیشتر حلقوں سے کتاب کی مخالفت میں آواز بلند ہوئی اور آخر حکومتِ وقت نے اسے ضبط کرلیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنا مختصر ناول "لندن کی ایک رات"

بھی شائع کیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں یعنی ہندستان واپس آنے سے کوئی سال بھر پہلے، انھوں نے لندن ہی میں ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا، محمد دین تاثیر کے ساتھ مل کر "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد ڈالی۔ اس کے اغراض و مقاصد کا پہلا مسوّدہ جیوتی گھوش نے تیّار کیا، پھر اس پر سب نے مل کر بحث کی اور نوک پلک درست کر کے اسے آخری شکل دے دی۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ ادب مقصدی ہونا چاہیے؛ اسے عوام کی زندگی اور تہذیبی روایات، خواہشات اور تمنّاؤں کا مظہر ہونا چاہیے؛ اور سب سے بڑھ کر اسے سرمایہ داری اور استحصال کا مخالف ہونا چاہیے، تاکہ لوگوں کی تربیت ہو سکے، اور وہ آزادی کی سی بیش بہا نعمت کی قدر پہچانیں اور اس کے حصول اور اس سے متمتّع ہونے کی تیاری کر سکیں۔ اس میں اردو یا کسی زبان کی تخصیص نہیں تھی۔ چونکہ ہندستان کی سب زبانوں کا ادب بیک وقت ان مقاصد کی تکمیل اور ملک کو آزادی کی شاہراہ پر ڈالنے میں ممد و معاون ہو سکتا تھا، اس لیے انجمن کا یہ مقصد بھی تھا کہ ملک کی سب زبانوں کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے اور ان کی تخلیقات کے دوسری ملکی زبانوں میں ترجمے شائع ہوں، جس سے ملک کی ادبی ترقی میں توازن اور یکجہتی پیدا ہو سکے۔

سجّاد ظہیر نے لندن سے اس انجمن کے اغراض و مقاصد کی نقلیں ہندستان کے مختلف حصّوں میں اپنے دوستوں کو بھیج دی تھیں، اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ انھیں اپنے اپنے حلقے کے ادیبوں کو دکھا کر ان کی رائے معلوم کریں اور ہو سکے، تو اُن کی تائید حاصل کر کے ان سے اس دستاویز پر دستخط کرائیں۔

سر وزیر حسن اودھ کورٹ سے سبکدوش ہونے کے بعد لکھنؤ سے نقلِ مکان کر کے الٰہ آباد میں مقیم ہو گئے تھے، اور یہاں باقاعدہ وکالت کرنے لگے تھے۔ سجّاد ظہیر ۱۹۳۶ء میں وطن واپس آئے، تو لامحالہ والدین کے پاس الٰہ آباد ہی میں رہنے لگے۔

اس وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا مرکزی دفتر نہرو خاندان کی عالیشان عمارت آنند بھون الٰہ آباد میں تھا اور جواہر لال نہرو اس کے کاموں کے کرتا دھرتا تھے۔ انھوں نے سجّاد ظہیر اور ان کے ساتھ کے چند نوجوانوں کو کانگریس کی تنظیم میں مختلف ذمہ دار عہدوں پر تعینات کر دیا۔ چنانچہ سجّاد ظہیر اس زمانے میں الٰہ آباد ضلع کانگریس کمیٹی کے سکرٹر مقرر ہوئے تھے۔ اب انھوں نے ملک کے مختلف صوبوں کا دورہ کیا۔ تقریباً دو سال تک وہ پشاور سے مدراس اور کراچی سے کلکتے تک زمین کا گز بنے رہے۔ ہر جگہ ادیبوں کے تعاون سے شہر شہر انجمن کی شاخیں قائم کیں، اور اس کی کل ہند کانفرنسیں منعقد کیں۔ یہ حقیقت ہے کہ چند ہی برس میں ادبی محاذ پر یہ تحریک سب سے زیادہ فعّال اور نتیجہ خیز بن گئی۔

لیکن حکومت کی نظر میں سجّاد ظہیر کی یہ تمام سرگرمیاں خلافِ قانون تھیں۔ ان کی قیام انگلستان کے زمانے سے نگرانی ہو رہی تھی۔ اوائلِ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ کمیونسٹ اس میں انگریزوں کے خلاف تھے؛ اور برملا اسے سامراجی جنگ قرار دے رہے تھے۔ اس پر حکومتِ ہند نے سب کمیونسٹ کارکنوں کی گرفتاری کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۰ میں سجّاد ظہیر بھی گرفتار کر کے سنٹرل جیل؛ لکھنؤ بھیج دیے گئے۔ یہاں وہ کوئی سال بھر رہے ہوں گے کہ بہت بیمار پڑ گئے اور انھیں جیل سے میڈیکل کالج منتقل کر دیا گیا۔ اس کے تھوڑے دن بعد جرمن افواج نے روس پر حملہ کر دیا۔ اب کمیونسٹ پارٹی کا رویّہ بدل گیا اور متعدد دوسرے رہنماؤں کے ساتھ سجّاد ظہیر بھی دو سال کی قید کے بعد مارچ ۱۹۴۲ء میں رہا ہو گئے۔

کمیونسٹ پارٹی کی زیرِ ہدایت سجّاد ظہیر اپریل ۱۹۴۲ء میں بمبئی چلے گئے؛ اور وہاں سے انھوں نے ہفتہ وار "قومی جنگ" جاری کیا۔ یہ اخبار بہت کامیاب رہا؛ اس کی اشاعت دس ہزار تک ترقّی کر گئی تھی۔ اس دوران میں سر وزیر حسن بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اس لیے والدہ کے

اصرار پر انھیں جولائی ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ واپس آنا پڑا، جہاں اپنی بیماری کے زمانے میں سر وزیر حسن مقیم تھے۔ اسی علالت میں ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔
جب تک ملک تقسیم نہیں ہوا تھا، کمیونسٹ پارٹی بھی ایک تھی اور اس کی تنظیم بھی ایک۔ پاکستان بننے کے بعد اس کا ایک عمومی جلسہ اپریل ۱۹۴۸ء میں کلکتے میں منعقد ہوا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کی الگ تنظیم کرنا چاہیے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے جناب زین العابدین احمد (زیڈ اے احمد، ممبر پارلیمنٹ) سے کہا گیا۔ لیکن کسی وجہ سے انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اب قرعۂ فال سجّاد ظہیر کے نام پڑا۔ ادھر حکومتِ ہند نے کمیونسٹ پارٹی کو خلافِ قانون انجمن قرار دے دیا اور اس کے بیشتر لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ سجّاد ظہیر بھی حراست میں لے لیے جاتے۔ لیکن یہ اس زمانے میں بہت بیمار اور وہیں کلکتے کے ایک اسپتال میں زیرِ علاج تھے، اس طرح گرفتاری سے بچ گئے۔ لیکن ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ جب طبیعت کچھ بحال ہوئی، تو یہ بھیس بدلے ہوئے لکھنؤ آئے اور پھر اسی طرح بھیس بدل کر اپنی والدہ کو بتائے بغیر ایک دن بمبئی اور وہاں سے ہوائی جہاز سے کراچی چلے گئے۔ بیوی سے بھی صرف اتنا کہا کہ میں باہر جا رہا ہوں، ایک سال تک واپس آجاؤں گا۔
لاہور میں رہ کر انھوں نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل کی اور اس کے جنرل سکتّر چنے گئے۔ اسی زمانے میں پاکستان کی حکومت نے بھی کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ لہٰذا یہ لوگ چھپ چھپا تے اپنا کام کرنے پر مجبور تھے۔ سجّاد ظہیر کو بھی رُو پوش ہونا پڑا۔ انھوں نے اس دور کا ایک لطیفہ سنایا تھا۔
تاجکستان (سوویت روس) کے مشہور ادیب ترسون زادہ اس زمانے میں لاہور آئے۔ قدرتاً انھیں معلوم تھا کہ سجّاد ظہیر وہاں ہیں۔ انھوں نے کسی دوست سے دریافت کیا کہ سجّاد ظہیر کہاں ہیں، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ ترسون زادہ انگریزی نہیں جانتے؛ انھوں نے سوال فارسی میں کیا تھا۔ مخاطب پاکستانی دوست جواب میں کہنا چاہتے تھے کہ سجّاد ظہیر آج کل "انڈرگراؤنڈ" ہیں، لیکن وہ فوراً اس کے لیے فارسی

کا لفظ تلاش نہ کر سکے ۔ انھوں نے لفظی ترجمہ کرتے ہوئے کہا: سجّاد ظہیر زیرِ زمین رفتہ است ۔ظاہر ہے کہ ترسون زادہ اس کا اس کے سوائے اور کیا مطلب لیتے کہ سجّاد ظہیر کا انتقال ہو گیا ہے ۔ اس پر انھوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ یہ حادثہ کب اور کیونکر پیش آیا؟ اس پر پاکستانی دوست نے بہت مشکل سے انھیں سمجھایا کہ ان کا کیا مدّعا تھا۔ جب حقیقت کھلی، تو دونوں بہت ہنسے ۔

سجّاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہونے کے باعث بہت دن رُوپوش رہے ۔ آخر کار حکومتِ پاکستان نے ۱۹۵۱ء میں مشہور راولپنڈی سازش کے مقدمے کی داغ بیل ڈال دی ۔ اس مقدّمے کے ملزموں میں بہت سے فوجی افسروں کے علاوہ چار سول کے آدمی بھی تھے ، سیّد سجّاد ظہیر، فیض احمد فیض، محمد حسین عطا اور بیگم نسیم (میجر جنرل اکبر خان کی بیوی) ۔ سجّاد ظہیر پہلے سے روپوش تھے اور پوری تلاش کے باوجود پولیس کو ان کا سُراغ نہیں ملا تھا ۔ مقدمہ شروع ہوا ، تو حکومت کو ان کی مزید تلاش ہوئی ۔ اس زمانے میں خان قربان علی خان پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس تھے ۔ حکومت نے ان سے تاکیداً کہا کہ خواہ کچھ ہو، سجّاد ظہیر کو بلا تاخیر گرفتار کر کے پیش کرو ۔ اس پر خان صاحب نے اپنے دستِ راست چودھری محمد اصغر کو بُلا کر حکم دیا کہ تم ہفتے بھر میں سجّاد ظہیر کو گرفتار نہیں کرتے، تو اپنے آپ کو ملازمت سے برطرف سمجھو ۔ اس پر پولیس نے اپنی تگ و دَو دو چند کر دی ۔

پولیس کو ایک مکان سے متعلق پہلے سے کچھ شبہہ تھا کہ سجّاد ظہیر شاید اس میں چھپے ہوئے ہیں؛ لیکن انھوں نے کبھی سنجیدگی سے اس پر توجہ نہیں کی تھی ۔ اب چودھری محمد اصغر کو جو نوکری سے برطرفی کی دھمکی ملی، تو انھوں نے سب سے پہلے اسی مکان کا رُخ کیا ۔ راتوں رات اس کے سامنے کے خالی قطعۂ زمین میں لکڑی کی ٹال قائم کر دی ۔ خفیہ پولیس کے سپاہی دکان چلانے لگے ، اور پولیس ہی کے آدمی زیادہ گاہک بھی تھے ۔ غرض اس طرح ۲۴ گھنٹے اس مشتبہ مکان کی نگرانی ہونے لگی ۔ پولیس نے دیکھا کہ ایک نازک سا

دھان پان آدمی اس مکان پر صبح شام آتا ہے، اور تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر چلا جاتا ہے۔ پوچھ گچھ سے پتا چلا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا باقاعدہ رکن ہے۔ اسے گرفتار کر کے پولیس نے اپنے ہتھکنڈے جو استعمال کیا، تو اس نے اُگل دیا کہ واقعی سجّاد ظہیر اسی مکان میں پوشیدہ ہیں اور میں صبح شام انھیں کھانا پہنچانے آتا ہوں۔ پولیس نے اگلے دن اسے برقع پہنا کر ساتھ لیا اور کہا کہ اپنے مخصوص طریقے سے مکان کا دروازہ کھٹکھٹاؤ تاکہ سجّاد ظہیر کو کسی طرح کا شبہہ نہ ہو۔ مانوس آواز جو سنی تو سجّاد ظہیر نے اندر سے کنڈی کھول دی۔ بھیس بدلنے کو یہ اس زمانے میں بڑی بڑی مونچھیں رکھے اور فرنٹیر کے مخصوص گھیر دار شلوار اور سلیٹی رنگ کے لمبے کرتے میں ملبوس تھے؛ اور اپنے حلقے میں "مولانا" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ محمد اصغر نے ان سے پوچھا: آپ کا نام؟ انھوں نے خیال کیا کہ اب جھوٹ بولنا بیسود ہے؛ کھیل تو ختم ہو ہی گیا ہے۔ چنانچہ نہایت اطمینان سے کہا: سجّاد ظہیر۔ غریب محمد اصغر اپنی ساری تھانیداریت کے باوجود ان کے سکون اور بے پروائی کے انداز سے بھونچکا رہ گیا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے مُنھ سے آواز تک نہ نکلی۔ جب اس کے حواس کچھ بجا ہوئے، تو اس نے آگے بڑھ کر پستول ان کی چھاتی پر رکھ دیا اور کہا کہ میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں، اپنے آپ کو حوالے کر دیجیے۔ اور یوں انھیں حراست میں لے لیا۔

راولپنڈی سازش مقدّمہ چلا۔ وکیلِ سرکار نے تو ان کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا، لیکن عدالت نے چار برس قید کا حکم سنا دیا۔ انھوں نے صرف دو سال حیدرآباد (سندھ) اور مچھ (بلوچستان) کے جیلوں میں کاٹے۔ فیض احمد فیض اور یہ جیل میں ایک ساتھ رہے تھے۔ فیض کا مجموعۂ کلام "زنداں نامہ" اسی زمانے کی یادگار ہے۔

ہوا یہ کہ ہندستان کی حکومت نے حکومتِ پاکستان پر ان کی رہائی کے لیے زور ڈالنا شروع کیا۔ دنیا کے اور ممالک کے ادیبوں نے بھی حکومتِ پاکستان سے اپیل کی۔ یہ کوششیں بارور ہوئیں اور جولائی ۱۹۵۵ء میں وہ رہا کر دیے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حکومتِ پاکستان نے ان پر واضح کر دیا کہ آپ اس ملک میں رہے، تو آزاد

نہیں رہ سکتے، آپ کی جگہ کال کوٹھری کی سلاخوں کے پیچھے ہوگی۔ ہاں، اگر چاہیں، تو آپ کہیں باہر جا سکتے ہیں۔ اس پر وہ اگست ۱۹۵۵ء میں ہندستان چلے آئے۔ وہ جاتے وقت بیوی سے یہ کہہ کر گئے تھے کہ سال بھر میں واپس آجاؤنگا؛ لیکن انھیں واپس آتے آتے سات برس سے زیادہ لگ گئے۔

پاکستان کے چار سالہ دورِ قید و بند میں انھوں نے دو کتابیں لکھیں۔ اوّل، تحریکِ ترقی پسند مصنّفین کی تاریخ "روشنائی" کے عنوان سے۔ یہ بعد کو دلّی سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب فارسی کے مشہور شاعر حافظ کا تنقیدی مطالعہ ہے، جسے انجمن ترقیِ اُردو نے "ذکرِ حافظ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ قید کے زمانے میں انھوں نے جو خط اپنی بیوی کو لکھے تھے، وہ بھی "خطوطِ زندان" کے عنوان سے ایک مجموعے میں چھپ چکے ہیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے شعر گوئی بھی شروع کی۔ دراصل ان کا یہ کلام شعر کی معروف تعریف کی ذیل میں نہیں آتا۔ یہ ایک طرح کی نثری نظم ہے۔ بہر حال اس پر تنقید کا یہ محل نہیں۔ ان کی یہ سب چیزیں "پگھلا نیلم" کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ ان کا ایک اور کتابچہ "ہندی ہندستانی" بھی ہے، جس میں زبان پر بحث کی گئی ہے۔

آنے کو وہ ہندستان آتو گئے، لیکن اصلی مشکل یہ تھی کہ وہ پاکستانی شہری تھے، اور اس حیثیت سے وہ زیادہ عرصے تک یہاں رہ نہیں سکتے تھے۔ اُدھر پاکستان انھیں آزادی سے اپنے وہاں رکھنے پر تیّار نہیں تھا۔ غرض عجیب گومگو کا معاملہ تھا۔ سجّاد ظہیر اس مذبذب صورتِ حال سے پریشان تھے۔ بارے یہ مسئلہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی ذاتی مداخلت اور سفارش پر طے ہوا؛ انھیں ہندستانی پاسپورٹ مل گیا اور حکومت نے انھیں ہندستانی شہری تسلیم کر لیا۔

۱۹۵۸ء میں "عوامی دور" کے مدیر بن کر وہ لکھنؤ سے دلّی آگئے۔ پھر جب نومبر ۱۹۶۳ء میں کمیونسٹ پارٹی نے دلّی سے ہفتہ وار "حیات" جاری کیا، تو وہ اس کے ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ اس کے بعد ان کا مستقل قیام یہیں رہا، اور وہ یہاں کی ادبی اور ثقافتی

زندگی میں بہت نمایاں حصّہ لینے لگے۔

۱۹۷۲ء میں انھوں نے روس، جرمنی اور انگلستان کا طویل دورہ کیا۔ وہ وہاں کے کتابخانوں میں امیر خسرو کے کلام نظم ونثر کے خطی نسخوں کا کھوج کرتے رہے، جن کا جشن روس اور ہندستان کے اشتراک سے ۱۹۷۴ء میں منانے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ ۱۹۷۳ء میں وہ پھر انگلستان گئے۔ وہاں سے انھیں افریقی، ایشیائی مصنّفین کی کانفرنس میں شرکت کے لیے قزاقستان (روس) کی راجدھانی "الماآتا" جانا تھا۔ لندن میں ان کی بڑی صاحبزادی نجمہ اپنے شوہر (علی باقر) کے ساتھ رہتی ہیں؛ وہ انھیں کے ہاں مقیم رہے۔

لندن سے وہ اگست کے آخر میں روانہ ہوئے اور چندے ماسکو میں قیام کرنے کے بعد الماآتا پہنچ گئے۔ مجوزہ کانفرنس ۴ سے ۹ ستمبر تک ہونے والی تھی۔ ۴ ستمبر صبح کے ناشتے پر بیٹھے تھے کہ ان پر دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹر آیا؛ اس نے آرام کا مشورہ دیا۔ اگرچہ انھوں نے تکلیف کا دلیری سے مقابلہ کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ساری عمر جس محنت سے کام کیا تھا، اس سے ان کا دل بہت کمزور ہو چکا تھا۔ نقاہت بتدریج بڑھتی گئی۔ ۱۱ ستمبر کی صبح وہ بیہوش ہوگئے، اور پھر آخری لمحے تک ہوش میں نہیں آئے۔ اسی حالت میں جمعرات ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء صبح کے ساڑھے گیارہ بجے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جسدِ خاکی ہفتہ ۱۵ ستمبر صبح کے وقت ہوائی جہاز سے نئی دلّی پہنچا اور انھیں جامعۂ ملّیۂ اسلامیہ کے قبرستان، جامعہ نگر میں خوابگاہِ ابدی نصیب ہوئی۔

اب قدرت کی ستم ظریفی کا افسانہ سنیے۔ ان کے آخری قیام لندن کے دوران میں ایک دن کسی دوست کے ہاں ڈنر پر ایک امریکی مہمان نے اُن سے پوچھا، آپ کو ہندستان کے باہر کونسا ملک یا شہر سب سے زیادہ پسند ہے، یقیناً یورپ کی کوئی جگہ ہوگی؟ سجاد ظہیر نے جواب میں کہا، نہیں، بلکہ مجھے روس کے ایشیائی علاقے اور ان میں بھی خاص طور پر قزاقستان کا خطّہ سب سے زیادہ پسند ہے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ مشکل سے دو ہفتے

بعد ان کی قزاقستان کے دارالخلافے الما آتا میں وفات ہونے والی ہے۔
ضمناً یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ "الما" کے معنی ہیں سیب اور "آتا" کے باپ (اتا ترک میں بھی اتا انھیں معنوں میں ہے، جو مصطفیٰ کمال پاشا کے لیے بولا جاتا ہے)۔ قزاقستان میں سیب بہت کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی بلا مبالغہ سینکڑوں قسمیں ہیں۔ ریاست کی ساری صنعت وحرفت اور ایک طرح سے پوری زندگی کا محور "سیب" ہی ہے۔ اسی لیے یہاں کے لوگوں نے اپنے دارالخلافہ کا نام ہی "الما آتا" رکھ دیا ہے۔
ولایت سے واپسی کے دو برس بعد استمبر ۱۹۳۸ء کو ان کی شادی سید رضا حسین پرنسپل اسلامیہ کالج، اجمیر کی صاحبزادی رضیہ سے ہوئی تھی۔ یہ اس وقت بی اے تھیں۔ بعد کو جب خاندان کا قیام الٰہ آباد میں تھا، تو انھوں نے ۱۹۴۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کر لیا۔ جب سجاد ظہیر "قومی جنگ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بمبئی میں مقیم تھے، تو رضیہ نے تدریس کی ٹریننگ حاصل کی اور وہیں رحمت اللہ کریم بھائی اسکول میں اردو پڑھانے پر مقرر ہوگئیں۔ یہاں انھوں نے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک تین برس کام کیا تھا۔ جب خاندان لکھنؤ واپس آیا، تو ۱۹۴۸ء میں وہ وہاں کرامت حسین گرلس کالج میں پڑھانے لگیں۔ وہ یہاں ۱۹۶۵ء تک رہیں، اور اس کے بعد بچوں سمیت دلی چلی آئیں۔ اولاد میں چار بیٹیاں ہیں: نجمہ، نسیم، نادرہ، نور۔ وہ رضیہ سجاد ظہیر کے نام سے افسانے کے میدان میں مشہور و معروف ہیں۔ وہ جب سے دلی آئی ہیں، یعنی ۱۹۶۵ء سے، سوویت دیس اخبار میں مترجم کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
سجاد ظہیر اپنے احباب میں "بنے بھائی" کے عُرف سے مشہور تھے۔ سب انھیں اسی نام سے خطاب کرتے تھے۔ لیکن شاید ہی کسی کو اس عُرف کی بنیاد معلوم ہو۔ ہے یہ کہ یوپی میں یہ عام رواج ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو ان کے بچپن کے زمانے میں لاڈ پیار سے کسی مختصر عُرف سے پکارتی ہیں۔ ان کے خاندان میں عرف یہ تھے: علی ظہیر: علّن؛ حسن ظہیر:

للّن؛ حسین ظہیر: مُنّن؛ سجاد ظہیر: بُنّن؛ باقر ظہیر: ننّن۔ پھر والدہ آگے بڑھیں، تو انھیں علی الترتیب علّے، للّے، مُنّے، بنّے، ننّے پکارنے لگیں۔ تو یہ ہے بنیاد بنّے بھائی کی۔

مرحوم ہماری گنگا جمنی تہذیب کا بینظیر نمونہ تھے۔ تمکین و وقار، سنجیدگی، کم گوئی اور رکھ رکھاؤ ان کی فطرت اور کردار کے اجزائے ترکیبی تھے۔ میں نے برسوں کی ملاقات میں کبھی ان کے منھ سے کسی کے خلاف کوئی کلمہ نہیں سُنا، گویا وہ کسی سے ناراض ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔

انھوں نے کچھ بہت زیادہ نہیں لکھا، اور ممکن ہے کہ جو کچھ لکھا ہے، وہ کبھی تاریخِ ادب اردو میں کوئی وقیع جگہ نہ پا سکے۔ لیکن ان کا ایک کارنامہ ایسا ہے، جسے کوئی مورّخِ زبانِ اردو نظر انداز نہیں کر سکتا؛ اور یہ ہے، ترقی پسند ادب کی تحریک۔ اس کی تاسیس، ترتیب، تشکیل میں جو رول انھوں نے ادا کیا اور اسے پروان چڑھانے میں انھوں نے جن تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، وہ کوئی شخص بھلا نہیں سکتا۔

اُردو ادب میں درحقیقت چار تحریکیں ایسی ہوئی ہیں، جن کے اثرات بہت دیر پا ہے، بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اول، فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی تحریک، جس کے نتیجے میں اردو نثر کو پہلی مرتبہ اپنی زندگی اور قوت کا احساس ہوا؛ گلکرسٹ اس کی روحِ رواں تھے۔ دوسری، دلّی کالج کی تحریک، جو بوترو اور اشپرنگر کے ہاتھوں بامِ ترقی تک پہنچی۔ اس میں تراجم و تصانیف کے ذریعے سے زبان کا دامن مالا مال ہوا۔ تیسری، سرسیّد اسکول کی تحریک۔ اس میں زبان کی تصنیفی صلاحتیں اپنے پورے عروج تک پہنچ گئیں۔ اس دور کی تصنیف و تالیف نے اُردو کو عالمی زبانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ اور چوتھی تحریک، یہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہے، جو ۱۹۳۶ء میں سجّاد ظہیر کی بدولت وجود میں آئی۔ اس نے اردو نظم و نثر کو نیا رُخ دے دیا۔ جو لوگ اس سے وابستہ تھے، انھیں تو اس کے مقاصد کو سامنے رکھنا ہی چاہیے تھا؛ لیکن جو ادیب اس سے باقاعدہ منسلک نہیں ہوئے، وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اس کے

بعد ان کی تخلیقات بھی نیا رنگ اختیار کرگئیں۔
ایسی عہد آفریں شخصیت کو بھلا کوئی بھلا سکتا ہے!
اب ان کے چند شعر سنیے:

دریا

آؤ میرے پاس آؤ نزدیک
یہاں سے دیکھیں
اس کھڑکی سے باہر
نیچے اک دریا بہتا ہے
دھندلی دھندلی ہلتی تصویروں کا
خاموشی سے بوجھل
زخمی سایوں میں
تیر چھپائے تھرتھراتے، جلتے
کناروں کے پہلو میں
بیکل، دکھی
اسے کبھی نیند نہیں آتی

محبّت کی موت

تم نے محبّت کو مرتے دیکھا ہے
چمکتی ہنستی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں
دل کے دالانوں میں پریشاں گرم لُو کے جھکّڑ چلتے ہیں
گلابی احساس کے بہتے سوتے خشک
اور لگتا ہے جیسے
کسی ہری بھری کھیتی پر پالا
پڑ جائے!

لیکن، یارب!

آرزو کے ان مرجھائے سوکھے پھولوں
ان گم شدہ جنتوں سے،
کیسی صندلی
دل آویز
خوشبوئیں آتی ہیں

تعزیت

ظلم کے پنجۂ منحوس نے بڑھتے بڑھتے — شجرِ زیست سے ایک اور ثمر توڑ لیا
جس کی تابش سے پہنچتی تھی دلوں کو ٹھنڈک — اس پہ شبخون کیا، وہ گلِ تر توڑ لیا
سینۂ لطف و کرم جس سے منور تھا، وہی — دستِ بیداد نے تابندہ گہر توڑ لیا

لیکن اے دوست! ذرا اپنے خزینے کو تو دیکھ — اس میں اک لعلِ گراں، شعلہ فگن ہے کہ نہیں
اس میں کچھ خونِ شہیداں کی جھلک ہے، ایسے — دُرِ خوش آب سے پُر، دل کی لگن ہے کہ نہیں
گو جبیں رنج سے واماندہ ہے، لیکن اُس پر — عزمِ انساں کی سغرور شکن ہے کہ نہیں

جذب عالمپوری، راگھوندر راؤ

۲۰ اپریل ۱۸۹۴ء کو گنگا وتی (ضلع رائچور، کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت رام راؤ تھے۔ لیکن یہ محض دو سال کے تھے کہ عالمپور (ضلع محبوب نگر، تلنگانہ، آندھرا پردیش) کی ایک متمول اور صاحبِ جاداد برہمن بیوہ شریمتی سیتا بائی نے انھیں گود لے لیا۔ اس کے بعد ان کا اپنے اصلی خاندان سے سلسلہ ٹوٹ گیا، اور وہ نئے خاندان کے چشم و چراغ بن گئے۔

ان کی تعلیم اچھے خاصے اہتمام سے ہوئی تھی اور وہ ہفت زبان تھے۔ تلگو تو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ کنڑی اپنے چچا پنڈت مادھو راؤ وکیل سے، اور اردو فارسی پنڈت رام نرسو سے پڑھی۔ سیّد مخدوم حسینی عرف خواجہ پیراں عربی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اسی طرح سنسکرت اور ہندی کی تعلیم کے لیے ایک پنڈت رکھے گئے تھے (افسوس کہ ان کا نام نہیں معلوم ہو سکا) چچا کی تقلید میں انھوں نے بھی وکالت کا پیشہ اختیار کرنا پسند کیا۔ چنانچہ جوڈیشل امتحان (اردو) میں بیٹھے اور وکالت کی سند حاصل کی۔ تقریباً پندرہ برس تک کامیابی سے وکالت کی۔ لیکن اس زمانے میں دن رات کی محنت سے ان کی صحت کچھ ایسی بگڑ گئی کہ انھیں بادلِ ناخواستہ اس پیشے سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی کوئی کام نہیں کیا اور اپنے آپ کو ہمہ تن شعر و ادب کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب ریاست حیدرآباد کا الحاق ہوا، تو وہ عالمپور سے نقلِ مکان کر کے حیدرآباد چلے آئے، اور مستقلاً یہیں کی سکونت اختیار کر لی۔

انھوں نے شعرگوئی ۱۶ برس کی عمر میں شروع کی۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب احمد حسن شوکت میرٹھی (ف دسمبر ۱۹۲۲ء) کا بڑا غلغلہ تھا؛ وہ اپنے آپ کو مجدّدِ السنۂ شرقیہ کہتے تھے؛ اور ان کے دو رسالے "پروانہ" اور "شحنۂ ہند" ان کے "تجدّد" کی تبلیغ ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا رہے تھے۔ جذب نے بھی اپنے کلام پر اصلاح کے لیے شوکت کا انتخاب کیا۔ غالباً چندے غلام محمد عُرف ترک علی شاہ ترکی (ف مارچ ۱۹۱۹ء) سے بھی مشورہ رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے سیّد نظیر حسن سخا دہلوی (ف فروری ۱۹۳۳ء) سے بھی استفادہ کیا؛ خاص طور پر عروض میں ان سے مشورہ کرتے رہے۔ ان دونوں حضرات کے انتقال کے بعد حیدر آباد کے مشہور رباعی گو شاعر حضرت امجد حسین امجد (ف مارچ ۱۹۶۱ء) اور جگر بریلوی سے رجوع کیا۔

جب تک عالپور میں قیام رہا، ان کی ذات مرکزِ شعروادب بنی رہی۔ انھوں نے یہاں "بزمِ نہالِ سخن" قائم کی تھی۔ اس کے ماہانہ جلسوں کی یہ خصوصیّت تھی کہ غزل اور نظم کے علاوہ اس میں نثری مضامین بھی پڑھے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان جلسوں کی شہرت دور دور تک پہنچی، اور باہر کے شاعر اور ادیب بھی ان میں شامل ہونے لگے۔ ان مشاعروں سے جہاں ریاستِ حیدر آباد کے دُور دست خطوں میں اردو کی ترویج ہوئی، وہیں خود ان کا نام بھی ساری ریاست میں شاعر اور محبِّ اردو کی حیثیت سے لوگوں میں مشہور ہو گیا۔

انھوں نے اسّی برس کے قریب عمر پائی۔ آخر تک تندرستی ٹھیک رہی؛ کوئی جسمانی عارضہ بھی لاحق نہیں تھا۔ لیکن کبر سِنّی کے باعث کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی میں ۲۷/۲۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کی درمیانی شب کے ڈھائی تین بجے (یعنی ۲۸ ستمبر کے ابتدائی وقت میں) رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اولاد میں ایک بیٹا (شری پرہلا دراؤ) اور تین صاحبزادیاں (بجے دیلوی، سجاگیما عرف لیلا بائی؛ راجمّا عرف سُندنا) اپنی یادگار چھوڑیں۔ شری پرہلا دراؤ میونسپل کارپوریشن، حیدر آباد میں ملازم ہیں۔

جذب نے رباعی کے میدان میں خاصی شہرت حاصل کی؛ بلکہ آندھرا اردو مجلس کی طرف

سے انھیں "خیاّم آندھرا" کا لقب بھی ملا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے رُباعی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ سازِ غزل بھی چھپ چکا ہے (حیدرآباد ۱۹۷۲ء) ان کے رباعیوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے: رباعیاتِ جذب، ارمغانِ جذب، صد پارۂ جذب (۱۹۶۴ء)؛ تحفۂ جذب (۱۹۶۹ء)؛ آہنگِ جذب (۱۹۷۰ء) آخرالذکر کے دو حصّے ہیں: احساساتِ جذب اور معلوماتِ جذب۔ ان کے سنسکرت، تلگو اور کنڑی کے منظوم تراجم اور ایک نثری تصنیف بھی شائع ہو چکی ہے بعض مسوّدے طبع ہونے سے رہ بھی گئے۔ ان میں جنوبی ہند (مدراس و میسور) کے شعرا کا ضخیم تذکرہ "خمخانۂ کہن" زیادہ اہم ہے، جسے انھوں نے ۱۳۷۱ھ میں مکمل کیا تھا۔ (نام تاریخی ہے)

کلاسیکی انداز کا بہت پختہ کلام ہے۔ تصوف کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ ہر جگہ زبان اور بیان کی پختگی ان کا مابہ الامتیاز ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا، جو ان کی وفات تک ملتا رہا۔

اب چند شعر ملاحظہ ہوں:

جو نفس کا بندہ ہے، وہ ناکام ہے کیوں؟ دنیائے وفا میں نفس بدنام ہے کیوں؟
ہے نفس بھی تیری دین، دل ہی کی طرح پھر نفس نوازی کا یہ الزام ہے کیوں؟

بجھ جائیگا اک روز چراغِ ہستی اک روز اجڑ جائیگا باغِ ہستی
مٹ جائیگا، اے جذب! ہر اک نقشِ وجود ڈھونڈے بھی ملیگا نہ سراغِ ہستی

جامِ عشرت کو کبھی بھر نہ سکے اور دورِ مصیبت میں کبھی مر نہ سکے
خوش بخت ہیں وہ جو نیکیاں کرتے ہیں جی بھر کے ہم گنہ کبھی کر نہ سکے

جو فلسفۂ حیات کا دانا ہے وہ رنج سے اور خوشی سے بے پرواہی
ہیں رنج و خوشی صرف فریبِ ہستی دنیا اپنی جگہ خود اک دھوکا ہی

گذری ہے ہمیشہ اشک پیتے پیتے گذری ہے جگر کے زخم سیتے سیتے
امید پہ دنیا میں رہے ہم زندہ آرام ملا کبھی نہ جیتے جیتے

یہ عالمِ عیش و خواب ہم پر بھی تو تھا | یہ سایۂ آفتاب ہم پر بھی تو تھا
تھے ہم بھی کبھی رونقِ عالم اے جذب! | کچھ دیر سا ہے شباب ہم پر بھی تو تھا

خاموشی میں اندازِ اثر پیدا کر | جو کبر سے خالی ہو وہ سر پیدا کر
ہر ذرہ میں کائنات پوشیدہ ہے | سب کچھ نظر آئیگا، نظر پیدا کر

افعالِ گزشتہ کو کبھی یاد نہ کر | مستقبل کے لیے بھی فریاد نہ کر
جو کچھ کہ ہوا، ہوا! جو ہوگا، ہوگا | تو فکر میں اپنی عمر برباد نہ کر

وہ جوشِ طبیعت، وہ روانی نہ رہی | وہ حرصِ وصال، وہ کامرانی نہ رہی
تھا جذب! شباب، اک جہانِ امید | جب وہ نہ رہا، تو زندگانی نہ رہی

اپنے خالق کو ایک مانا میں نے | چھانا تحقیق میں زمانا میں نے
سمجھا تو یہی کہ کچھ نہ سمجھا اے جذب! | جانا تو یہی کہ کچھ نہ جانا میں نے

دل آئینہ ہے جلا کہاں ہوتا ہے | بے سعی بھی کوئی کامراں ہوتا ہے
گھٹتی ہے سیاحت سے کدورت دل کی | پانی ہے وہ پاک جو رواں ہوتا ہے

معشوق و شراب دہ کنار اور بھی ہیں | پابندِ ہوس سیاہ کار اور بھی ہیں
مجھ پر ہی فقط عتاب تیرا کیوں ہے؟ | میری ہی طرح گناہگار اور بھی ہیں

کس سمت ہے جلوہ گاہ، معلوم نہیں | کب تک بھٹکے نگاہ، معلوم نہیں
خود آ، اے دوست! رہنمائی کر لے | مجھ کو ترے گھر کی راہ، معلوم نہیں

کہیں ہے ابرِ بہارِ گلشن، کہیں ہے شبنم، کہیں ہیں آنسو
ہزار پردوں میں رنگ و بو کے برس رہا ہے شباب تیرا

اگر کفر ہی پر بنا عشق کی ہے | تو کافر ہے پھر جو مسلمان ہوگا
ارے دستِ جنوں کی یہ درازی | کہاں تک سلسلہ ہے پیرہن کا

ہر شئے اعتبار و یقیں رایگاں ہے اب | دنیا میں اعتبار کسی کا کہاں ہے اب!
جذب! چل راہِ محبت میں جدھر دل لے جائے | راہبر سے نہ توقع کسی رہگیر سے کر
گو جانتا ہوں، تجھ کو خبر بھی نہیں ہوئی | لیتا ہوں پھر بھی نام تیرا بار بار روز

مجھے مطلب ہے سجدہ کرنے سے بُت ہے یا وہ خدا، نہیں معلوم

بڑی مشکل سے ہم لائے گئے تھے تیری محفل میں
مگر محفل سے اٹھ جانے کا پھر ارمان ہے دل میں

سجدوں کا شغل اے دلِ سودا نشاں نہ چھوڑ سر چاہے ساتھ چھوڑ دے، تو آستاں نہ چھوڑ

آنکھوں میں آگیا ہے سمٹ کر جہانِ دل میری نگاہ دیکھ، مرا مدّعا نہ پوچھ
وہ آئے، اور چلے گئے بزمِ خیال سے اتنی ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا، نہ پوچھ
ہر رہنما ہے جادۂ منزل میں راہزن چاہے بھٹک ہی جائیے، مگر راستا نہ پوچھ

مر رہے ہیں، مگر نہیں مرتے واہ کیا زندگی ہماری ہے
میری نظروں کی خیرہ سامانی تیرے جلووں کی پاسداری ہے
دل تمھارا ہے، میری چیز نہیں جان میری نہیں، تمھاری ہے

جاگتے ہیں پھول، جگنو، برگ و بار آج تقدیرِ چمن بیدار ہے
ہے یہ طوفاں صرف تا حدِّ جمود دل میں لہر اٹھی، تو بیڑا پار ہے
کر لیا اقرار میں نے آپ کا اب مجھے ہر چیز سے انکار ہے

یہ تیزی، یہ خرامِ حسن، توبہ! وہ چلتے ہیں کہ لڑتے ہیں ہوا سے

بس اک سادہ نگاہی ہے دلِ ناکارہ کی قیمت
زیادہ ہو، تو پھر جو کچھ مزاجِ یار میں آئے

عشق کی لذّت نہ پوچھ، اے ہمنشیں! عشق، بس اک لذّتِ بے نام ہے

اختر حیدر آبادی، سردار بیگم

۹ مارچ ۱۹۱۸ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کی نواب اعظم یار جنگ چراغ علی سے کچھ عزیزداری تھی، لیکن میں رشتہ متعین کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ ان کے والد سیّد امیر حسن تھے اور دادا سیّد کریم حسن قمر لکھنوی۔ قمر شعر کہتے تھے اور داغ کے شاگرد تھے۔ اصل میں یہ خاندان لکھنوی تھا۔ لیکن اودھ کے الحاق کے بعد ان کے آبا و اجداد ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور جا کر حیدر آباد میں بس گئے۔ جب سے یہ لوگ عزت و آبرو سے یہیں بسر کر رہے ہیں۔

سیّد امیر حسن کا ۱۹۲۲ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سردار بیگم کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بار اُن کے چچا محبوب علی صاحب کے کندھوں پر آ پڑا۔ انھوں نے ابتدا میں کچھ تھوڑا بہت گھر پر پڑھا؛ اس کے بعد محبوبیہ گرلس اسکول، حیدر آباد میں تعلیم پائی۔ بہت جلد خان صاحب عبد الغنی رئیس نصیر آباد چھاؤنی (راجستھان) سے شادی ہو گئی، جو قنوج میں ٹھیکیداری کرتے تھے؛ اور اسی سلسلے میں کانپور میں سکونت پذیر تھے۔

سردار بیگم کے مزاج میں شروع سے ولولہ اور سیمابیّت تھی۔ یہ سیاسی ہلچل کا زمانہ تھا۔ چنانچہ وہ بھی ان سرگرمیوں میں حصّہ لینے لگیں۔ اوّلاً علّامہ عنایت اللہ خان مشرقی (ف اگست ۱۹۶۳ء) کی خاکسار تحریک میں اور بعد کو مسلم لیگ کے دور میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ خان صاحب عبد الغنی متمول آدمی تھے؛ سردار بیگم کی ذاتی ملکیّت ایک سنیما گھر (لبرٹی تھیٹر) بھی تھا، غرض مالی پہلو سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ لہٰذا سماجی اور سیاسی ذوق کی تسکین ان کے لیے آسان تھی۔ انھوں

نے مشرقِ بعید کا سفر بھی کیا تھا۔ بعد کو جب عبد الغنی صاحب نے بنگلور میں مستقل سکونت اختیار کی، تو سردار بیگم بھی ان کے ساتھ وہیں مقیم ہو گئیں۔ ۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو بنگلور ہی میں رحلت ہوئی؛ اپنے سکونت کے بنگلے (السّرور) میں دفن ہوئیں جسمانی یادگار صرف ایک لڑکا عثمان غنی (عرف منّا) چھوڑا۔

ان کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں۔ پہلی "صحیفۂ درخشاں" کے عنوان سے، اس میں نعتیہ کلام ہے؛ دوسری "تضمینِ اقبال" جس میں اقبال کی بعض نظموں کی تضمین کی ہے۔

اب چند شعر بطور نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے:

سنگاپور میں ایک مسلم دوشیزہ کو محوِ رقص دیکھ کر

حسن کی عریانیاں، باعثِ فخر و کمال ۔۔۔ عظمتِ انسانیت، آہ یہ تیرا زوال

کاش کے ملتا مجھے جلوۂ ماضی ترا ۔۔۔ آہ، ودیعت ہوا مجھ کو ترا عہدِ حال

سنگِ خرد بارِ عقل، ہو ہی گیا کامیاب ۔۔۔ آ ہی گیا آخرش شیشۂ ہستی میں بال

کفشِ، ادائوں کے ساتھ، آج ہے محوِ خرام ۔۔۔ گردنِ اخلاق پر خنجرِ تہذیبِ جال

جلوۂ افرنگ کی، آہ! یہ افسوں گری ۔۔۔ کل کہ جو شے تھی حرام، آج وہ شے ہے حلال

حسن کہاں حسن کا صرف ہے وہم و فریب ۔۔۔ عشق نہیں، عشق کا صرف ہے اک اختلال

حسن میں ہے اب کہاں دلکشی و زندگی ۔۔۔ پست ہے ذوقِ نظر، مردہ ہے ذوقِ جمال

عشق کو افسوس ہے حسن کی تقدیر پر ۔۔۔ ایک نگاہِ ہوس، قیمتِ نار و جمال

سازِ رمِ ذوق میں، بر لبِ پُر شوق میں ۔۔۔ اب نہ سرودِ نیاز، اب نہ فغانِ بلال

پی کے مئے مغربی، آ نہ بہت جوش میں ۔۔۔ ہوش میں آ، ہوش میں؛ ترا نہیں یہ کمال

چشمِ بصیرت مری دیکھ چکی آہ، آہ!
موت سے پہلے ترا سانحۂ ارتحال

عالمِ رنگ و نغمہ میں کیف بہت سہی، مگر ۔۔۔ بیخودِ سیرِ کائنات، اپنی طرف بھی اک نظر

ان کی بھی آنکھ، ہو گئی جوشِ الم سے آج تر ۔۔۔ میں نے اٹھائی کیوں نگاہ، عالمِ درد میں اُدھر

یوں نہ پہنچ سکیگا تو، ان کی حریم ناز میں — عشق کی تیغ تیز سے عقل سے پہلے جنگ کر
شکلِ حسیں دکھائے جا، پردۂ درمیاں اٹھا — شوق مرا ہے پارسا، عشق مرا ہے معتبر
میری تمیزِ شوق کو ایک زمانہ چاہیے — تیرا لہو ابھی ہے سرد، میری نوا ہے گرم تر
آہ شرابِ شوق کا کیف بہت عجیب ہے — وہ ہیں کہ مجھ سے بے نیاز، اور میں ان سے بیخبر

تیری فغاں نے کر دیا سینۂ گل کو چاک چاک
اخترِ خوش نوا خموش! اخترِ خوش نوا ٹھہر

کسی کھوئے ہوئے کی جستجو کیا — کسی بچھڑے ہوئے کی آرزو کیا
ترے رُخسارِ رنگیں کے مقابل — گل و گلزار میں ہے رنگ و بو کیا
نماز عاشقاں ہیں، اے عزیزو! — تیمم کس کو کہتے ہیں، وضو کیا
نہ آئے آج تک، تو روزِ محشر — وہ آئینگے ہمارے روبرو کیا

پہنچ جاؤں شہرِ لولاک کے پاس
مری ہے اور، اختر! آرزو کیا!

تبسّم ہی تبسّم ہے، جوانی ہی جوانی ہے۔
خدا رکھے، محبّت حاصلِ صد زندگانی ہے

کیا پوچھتے ہو عشق کی افتاد کا عالم — خاموش بھی رہنے میں ہے فریاد کا عالم
ہر سانس میں، ہے حُسنِ پُر آشوب کا پیغام — ہر گام پہ ہے عشقِ ستم زاد کا عالم
اُف ارے آئینِ محبّت! لب ہلا سکتے نہیں — نالہ کر سکتے نہیں، نغمہ سنا سکتے نہیں
واہ رے جذبِ محبّت! اُف رے مجبوریِ حسن! — بھول جانے پر بھی، وہ مجھ کو بھلا سکتے نہیں
مختصر ہے بس یہ، اختر! شرحِ آدابِ وفا — آگ سی دل میں لگی ہے اور بجھا سکتے نہیں
جن سے ہوا تھا کبھی سینۂ عالم گداز — مجھ کو سنا دیجیے، پھر وہ نوا ہائے راز
ذوقِ طلب ہے، تو پھر سُود و زیاں سے گزر — راہِ وفا میں نہ کر فکرِ نشیب و فراز

آ ہی گئی آج نیند، سنگِ درِ یار پر
بیخودیِ آرزو، عمر ہو تیری دراز!

بحر و مجبوب، راجا محمد امیر احمد خان (والیِ محمود آباد)

دادھیالی سلسلہ مشہور صحابی محمد بن ابی بکرؓ تک پہنچتا ہے۔ ان کے اجداد میں ایک صاحب نصر اللہ، جو بغداد میں عہدۂ قضائت پر فائز تھے، بارھویں صدی میں ہجرت کر کے ہندستان چلے آئے! یہاں بھی ان کی تین نسلیں دلّی میں اسی عہدے پر متمکن رہیں۔ ۱۳۴۵ء میں خاندان کے ایک فرد قاضی نصرت اللہ (عرف شیخ نتھن) کو محمد بن تغلق نے ضلع بارہ بنکی کے سرکش قبیلے "بھار" کی سرکوبی کا حکم دیا، اور ان کی کامیابی پر انھیں جاگیر عطا کی۔ ایک دوسرے فرد داؤد خان نے بھی بہت شہرت حاصل کی۔ انھیں کے بیٹے محمود خان نے محمود آباد بسایا تھا۔

مغلوں کے بعد اودھ کے شاہی زمانے میں بھی ان کا اقتدار اور جاہ و جلال قائم رہا۔ ۱۸۵۰ء میں شاہِ اودھ نے خاندان کے سربراہ نواب علی خان کو راجا کا خطاب عطا کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں راجا نواب علی خان نے بھی سرگرم حصّہ لیا تھا، لیکن آخرکار انھیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے محمد امیر حسن خان نے رفاہِ عامّہ کے کاموں میں خاص طور پر بہت حصّہ لیا۔ انگریزوں نے اُن کا شاہی خطاب تسلیم کر لیا، بلکہ اپنی طرف سے اس پر K.C.I.E کا اضافہ کر دیا۔ ان کی وفات (۱۹۰۳ء) پر ان کے بڑے صاحبزادے راجا محمد علی محمد خان ان کے جانشین ہوئے۔ انگریزوں نے انھیں ذاتی خطاب مہاراجا سے نوازا تھا۔ مہاراجا محمد علی محمد خان اپنے زمانے کی مشہور شخصیت تھے۔ اس عہد کی بیشتر تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔ وہ مجلسِ واضعِ قوانین کے رکن بھی رہے تھے۔

مرحوم راجا محمد امیر احمد خاں انھیں مہاراجا محمد علی محمد خاں کے بڑے صاحبزادے اور جانشین تھے۔ ان کے نانا سیّد فیاض حسین کنتوری تھے۔ جن کا سلسلۂ نسب امام ہفتم حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہ السّلام سے ملتا ہے۔ راجا محمد امیر احمد خاں جمعرات ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو محمود آباد میں پیدا ہوئے۔ سنِ شعور کو پہنچے، تو تعلیم کا نجی انتظام کیا گیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم کے لیے مولانا سیّد ظفر مہدی گُہر مقرر ہوئے۔ عزیز لکھنوی پہلے سے بحیثیت کتابدار ریاست کی ملازمت سے منسلک تھے؛ وہ اردو زبان و ادب کے درس کے ذمہ دار قرار پائے۔ اسی طرح انگریزی پڑھانے پر بھی ایک استاد مقرر ہوئے۔ جب چند برس میں یہ مراحل بحسن و خوبی طے ہو گئے، تو لکھنؤ کے مشہور لامانٹینیر کالج سے سینیر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنے برادرِ خورد مہاراجکمار امیر حیدر خاں کے ساتھ مزید تعلیم کے لیے انگلستان بھیجے گئے، لیکن اسی دوران میں ان کے والد مہاراجا محمد علی محمد خاں بہادر کا انتقال ہو گیا، اور انھیں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ البتّہ چھوٹے مہاراجکمار وہیں رہے اور انھوں نے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔

چونکہ دونوں بھائی کمسن تھے، اس لیے ان کی صغر سنی کے زمانے میں ریاست کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے مہاراجا محمد علی محمد خاں مرحوم نے اپنی وفات سے پہلے ایک مجلسِ اُمناء (بورڈ آف ٹرسٹیز) کی تشکیل کی تھی، جس کے اراکین مسٹر محمد علی جناح، سر وزیر حسن، ایم۔ بہادر شاہ اور ڈپٹی حبیب اللہ تھے۔ اس مجلس نے راجا امیر احمد خاں کے بالغ ہونے تک محمود آباد کے نظم و نسق کی نگرانی کی۔

راجا امیر احمد خاں کو ۱۹۳۶ء میں پورے اختیارات عطا ہوئے۔ یہ ہندستان کی سیاست کا بیحد ہنگامہ خیز اور فیصلہ کن دور تھا۔ ممکن ہے، مجلسِ اُمناء کے اراکین کے نقطۂ خیال کا بھی کچھ اثر رہا ہو، بہرحال راجہ صاحب موصوف مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا، اس کا سارا انتظام بھی انھیں نے کیا تھا اور اس کے جملہ اخراجات (دو لاکھ روپیہ) بھی خود برداشت کیے تھے۔ اس

کے بعد وہ مدّتوں مسلم لیگ کے خازن رہے اور رفتہ رفتہ اس کے صفِ اوّل کے کارکن کی حیثیت سے انھوں نے بہت نام پیدا کیا۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے گیارہ برس میں وہ ملکی سیاست کے مرکز میں رہے۔ اس دور میں ان کی ملاقات بعض سیاسی لیڈروں سے ہوئی، جن میں پی، سی جوشی اور سیّد سجّاد ظہیر نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان اصحاب کی ترغیب پر انھوں نے کمیونسٹ لٹریچر کا وسیع مطالعہ کیا۔ اپنی ٹھیٹ مذہبیّت اور اسلام پر اٹل اعتقاد کے باعث وہ کمیونسٹ تو بن نہیں سکتے تھے، لیکن بہرحال وہ اشتراکی خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ انھوں نے اشتراکیت کا غائر مطالعہ کیا، تو ان پر یہ حقیقت اور واضح ہوگئی کہ اسلام کا اقتصادی نظام کسی طرح اشتراکی طریقے سے کم منصفانہ نہیں۔ کمی ہے تو اس کی کہ اسے پورے پر نافذ نہیں کیا جاتا۔ اس پر انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کا آغاز ریاست محمود آباد سے کیا جائے۔

انھوں نے حکم دیا کہ تمام زمین کی پوری جانچ پڑتال کی جائے، مزارعین کے نام اس قطعۂ زمین کے گوشوارے میں درج ہوں، جسے وہ کاشت کرتے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پوری ریاست کی املاک ایک انجمنِ امدادِ باہمی (کوآپریٹو سوسائٹی) میں تبدیل کر دی جائیں، جس میں وہ خود اور ان کے تمام مزارع حصہ دار ہوں؛ اور سب کو حصّہ رسدی منافع میں شریک کیا جائے۔ لیکن بدلتے حالات کے باعث ان کا یہ منصوبہ پورا نہ ہوسکا۔

۱۹۴۷ء میں آزادی آئی، ملک تقسیم ہوا، اور حالات نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ ہندستان سے ہجرت کر جائیں۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ پاکستان میں بھی نہ رہ سکے، جس کے قیام کے لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانی دی تھی۔ چنانچہ دل برداشتہ ہو کر وہ بغداد (عراق) چلے گئے۔ چونکہ ان کے معتقدات کے تمام مراکز اسی ملک میں تھے، اس لیے یہاں کا قیام ان کے لیے تسکینِ روح و دماغ کا باعث ثابت ہوا۔ بسر اوقات کے لیے انھوں نے تجارت کا سہارا لیا۔ شہر میں مشینوں کی اچھی خاصی وسیع دکان کھول

لی۔ میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں یہیں بغداد میں ہوئی۔
راجا صاحب موصوف کبھی کبھی پاکستان جاتے رہتے تھے۔ وہاں ان کی کچھ سکنی جاداد بھی تھی! اس کی دیکھ بھال بھی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ احباب کی بھی کمی نہیں تھی، ان سے ملتے۔ کئی مرتبہ ان سے وزارت میں شامل ہونے کی درخواست کی گئی۔ لیکن وہ حالات سے سمجھوتا نہ کر سکے اور انھوں نے ہر مرتبہ اس سے انکار کر دیا۔ لیکن اس میں بھی شبہہ نہیں کہ ان کی مالی حالت بہت کمزور ہو گئی تھی اور وہ اس پہلو سے فکرمند تھے۔ حسنِ اتفاق سے اس کا ایک حل نکل آیا۔

۱۹۵۸ء (یا شاید ۱۹۵۹ء) میں دول العربیہ (عرب لیگ) نے فیصلہ کیا کہ لندن میں ایک اسلامی ثقافتی مرکز قائم کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے دس لاکھ پونڈ کا سرمایہ جمع کیا، جس کا بیشتر حصہ غالباً سعودی عرب اور کویت نے دیا تھا۔ حکومتِ انگلستان کا رویّہ ہمدردانہ تھا، کچھ گفت و شنید کے بعد وہ شہر کے وسط (پارک روڈ ریجنٹ) میں ایک پرانی تاریخی عمارت مجوزہ مرکز کے لیے دینے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ دفتر کھل گیا اور اس کے پہلے مدیر ایک مصری صاحب (ذکی عبدالقادر) مقرر ہوئے۔ ان کا تقرّر تین سال کے لیے ہوا تھا۔ جب ۱۹۶۱ء میں ان کی میعاد ختم ہو گئی اور وہ قاہرہ واپس چلے گئے، تو تھوڑی سی کوشش سے ان کی جگہ پر راجا صاحب موصوف کا تقرّر ہو گیا۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک میں بلجیم میں مقیم رہا تھا۔ اس زمانے میں بار ہا لندن جانے کا موقع ملا۔ اور چونکہ میرے ایک عزیز دوست وہاں اسی اسلامی مرکز میں عربی پڑھانے پر تعینات تھے، اس لیے اکثر وہاں جاتا، یوں راجا صاحب مرحوم سے بھی ہمیشہ ملاقات ہوتی رہی۔ میں آخری مرتبہ جون ۱۹۶۹ء میں یورپ اور لندن گیا، تو پھر حاضرِ خدمت ہوا۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ ان کے لطف و کرم کی یاد میرا سرمایۂ حیات ہے۔

چونکہ زندگی بیحد سادہ تھی، اور محنت کے عادی تھے، اس لیے صحت بالعموم ہمیشہ اچھی

رہی۔ لیکن وقتِ موعود تو کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء یوم جمعہ، ۱۴ رمضان ۱۳۹۳ھ کو دفعتہً فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ بیہوش ہو گئے۔ فوراً اسپتال پہنچائے گئے۔ علاج معالجے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ لیکن بیسود۔ اسی حالت میں دو دن بعد (۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء) اتوار صبح کے وقت اپنے خالقِ حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ان کے خاندان کی خاص ہڑواڑ کربلائے معلیٰ میں موجود ہے، نعش کو وہیں دفن کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن انھیں ایام میں مغربی ایشیا میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور محفوظ ذرائع آمد و رفت کا فقدان تھا۔ اس لیے طے ہوا کہ فی الحال لاش امانتہً روضۂ امام ضامن، مشہد (ایران) میں سپرد کر دی جائے، بعد کو جب حالات سازگار ہوں، اسے کربلائے معلیٰ منتقل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کے مطابق لاش ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو لندن سے تہران آئی، اور اسی دن مشہد پہنچی، جہاں اسے قبرستان "باغِ رضوان" میں سپرد کیا گیا۔

متعدد اصحاب نے تاریخ وفات کہی ہے۔ مزاح نگار شاعر سیّد مبارک حسین ڈیوٹ نے عیسوی تاریخ کہی: خلد میں فخرِ دو عالم والیِ محمود آباد (۱۹۷۳ء) اور ہجری میں ڈاکٹر ارشاد علی کیف محمود آبادی کا پورا شعر ہے:

فکرِ تاریخ مرگ کیا ہو گی   کیف غم ہی نے دل کو توڑ دیا
"کہیے راجا امیر احمد نے   بزمِ ہستی کو آہ چھوڑ دیا" (۱۳۹۳ھ)

مرحوم کو ادب سے شغف اور شعر گوئی ورثے میں ملی تھی۔ ان کے پردادا راجا نواب علی خان بہادر شعر کہتے تھے، اور اس میں غالباً آغا حجو شرف لکھنوی کے شاگرد تھے۔ دادا راجا محمد امیر حسن خان بہادر مرثیہ کہتے تھے اور اس میں حبیب تخلص کرتے تھے؛ غزل میں ان کا تخلص سحر تھا۔ نفیس لکھنوی کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ ممکن ہے، ان سے مشورہ بھی رہا ہو۔ مرحوم کے والد مہا راجا محمد علی محمد خان بہادر کا تخلص مرثیے میں محب اور غزل میں ساحر تھا۔ اسی روایت کو راجا محمد امیر احمد خان نے جاری رکھا؛ مرثیہ میں اُن کا تخلص محبوب تھا اور غزل میں بحر؛

کلام پر اصلاح میر علی محمد صاحب عارف سے لی۔

انھوں نے مرثیے میں مسدّس کی کلاسیکی ہیئت قائم رکھتے ہوئے، اس میں نئے مضامین اور رجحانات داخل کیے۔ مرثیہ پڑھتے بھی خوب تھے اور اس میں بھی انھیں خاص امتیاز حاصل تھا۔ نہ صرف محمود آباد ہی میں، بلکہ کبھی کبھی بےتکلف احباب کے اصرار پر باہر بھی مجلس میں پڑھنے میں تامّل نہیں تھا۔ گاہے گاہے نجی صحبتوں میں سوز اور نوحہ بھی پڑھتے تھے جن اصحاب نے انھیں پڑھتے سنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ خاندانِ انیس کے کامیاب نمایندے تھے۔

افسوس کہ کلام کا مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ صرف کچھ مرثیے اور سلام اور چند غزلیں رسالوں میں چھپی ہیں۔ ایک مرثیے کے چند ابتدائی بند اور کچھ اور کلام جو بعض رسائل سے جمع کیا گیا ہے، بطور نمونہ نذرِ ناظرین ہے:

مرثیہ

جہاں کے واسطے ہے وجہِ زندگی پانی ہے چشمِ عالمِ ایجاد کی تری پانی
رگوں میں دہر کی دوڑا کیا یہی پانی اسی سے شکلِ اہلِ جہاں ہوئی پانی
بڑھے ہوئے ہیں اسی سے تپاک کے دامن
اسی نے رنگ دیے صحنِ خاک کے دامن

اسی سے پائی ہے روحِ حیات ہستی نے چھلک پڑے ہیں اسی سے فلک کے گنجینے
اسی کے دم سے کشادہ بحار کے سینے اسی نے نصب کیے ہیں جہاں میں آیینے
زمانے بھر کے لیے وجہِ زندگانی ہے
فلک کی آنکھ کا تارا زمیں کا پانی ہے

اسی کی وجہ سے آباد دَورِ دارِ حیات اسی سے گلشنِ ہستی میں ہے بہارِ حیات
اسی کے دم سے ہے وابستہ اعتبارِ حیات یہی ہے جانِ حیات اور یہی مدارِ حیات
ہے روح ہر متحرک کی اور ساکن کی
صدا سنو تو مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ کی

؎ سورۂ انبیاء، ۲۱ : ۳۰

خزاں کے زور اسی کی نمود سے ٹوٹے
مزے اسی سے چمن نے بہار کے لوٹے
اسی نے دامنِ گل پر بنائے گل بوٹے
اسی کی چوٹ سے گلشن میں آبلے پھوٹے
اسی کی آب نے گوہر کو کر دیا پانی
اسی نے گل کے کٹوروں میں بھر دیا پانی

اسی نے چادرِ خشکی زمین سے چھینی
ہے اس کی سادگیوں میں غضب کی رنگینی
اسی نے گل کو سکھائی چمن میں رنگینی
اسی کے قطروں میں پنہاں ہے حسنِ آئینی
سحابِ تر کو برسنا سکھا دیا اس نے
گلوں کو باغ میں ہنسنا سکھا دیا اس نے

وجودِ لالہ و نسرین و نسترن اس سے
جہاں میں آتشِ گلزار شعلہ زن اس سے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا چمن اس سے
بغیر رنگ ہے پوشاکِ یاسمن اس سے
اسی کے آب سے رونق بڑھی ہے گلشن میں
اسی نے آگ لگا دی چمن کے دامن میں

سکھائیں پھولوں کو صحرا نوردیاں، اس نے
شمیمِ گل کو دیں آوارہ گردیاں اس نے
خزاں کے چہرے سے دھوئی ہیں زردیاں اس نے
لباسِ باغ پہ کھولی ہیں فردیاں اس نے
گلوں کے بھیس میں قطروں کے ڈھنگ بدلے ہیں
خدا کی شان کہ پانی نے رنگ بدلے ہیں

اسی کے جُود سے پُر ہیں بحار کے آغوش
اندھیری رات میں، ہے حکمراں اسی کا خروش
زبانیں موجوں کی چلنے لگی ہیں دوش بدوش
یہ سو زبانوں سے گویا ہے، اور پھر خاموش
یہی وہ ہے کہیں اونچا ہوا اگر سر سے
تو اس کے فیض سے کشتِ عمل میں ہُن برسے

فیوض پاتے ہیں مسلم بھی اور کافر بھی
ہے دامن اس کا مُطہّر بھی اور طاہر بھی
ہے ایک طرح سے باطن بھی اور ظاہر بھی
مقیم بھی ہے مثالِ نظر مسافر بھی

نگاہِ عقل میں رتبہ وسیع ہے اس کا
یہ بحرِ فیض ہے دامن وسیع ہے اس کا

وہ اپنا فضل و کرم صبح و شام کرتا ہے — وہ اپنی نعمتیں یونہی تمام کرتا ہے
وفورِ آب سے اک فیضِ عام کرتا ہے — وہ ایسی چیزوں کی قیمت حرام کرتا ہے

خیال اُس کو ازل سے ہے نفعِ خلقت کا
اور آپ سمجھے ذریعہ ملا تجارت کا

جہاں کے واسطے سقا بنیں یہی نہریں — چلیں جبال کی چوٹی سے، منچلی نہریں
کریں فریضۂ واجب میں کیوں کمی نہریں — زمیں پہ پھیل گئیں، دوڑتی ہوئی نہریں

خود اپنی موجوں سے ہونے لگیں لجام بکف
کوئی ہے مشک بدوش، اور کوئی جام بکف

زمانہ کیسے ہو سیراب، کیسے نعمت پائے — جو پستیوں میں رہے، اوج پر وہ کیونکر آئے
مجال کس کی، جو دریا کو آسماں پہ چڑھائے — یہ کس میں تاب کہ ساگن کو سیر کا رہنائے

بحار حکم سے، دنیائے انقلاب بنے
پسینے ماتھے پہ آنے لگے، سحاب بنے

یہ ظرف بحر کا آئینہ دار بن کے چلا — بڑھا جو سوزِ جگر تو بخار بن کے چلا
فلک کی سمت سفیرِ بخار بن کے چلا — ہوا کے دوش پر ابرِ بہار بن کے چلا

خزاں کے زور کو اک پل میں توڑ دیتا ہے
کسی کے حکم سے دامن نچوڑ دیتا ہے

سُبک مثالِ ہوا، اور پھر گرانی ہے — سحابِ فیض کی اٹھتی ہوئی جوانی ہے
جمالِ برق کو ہر لحظہ ضو فشانی ہے — خدا کی شان کہ دامن کی آگ پانی ہے

ذرا سی چوٹ پڑی، دل کے داغ جلنے لگے
اندھیری رات جو پائی چراغ جلنے لگے

شبِ سیاہ کے پردے بڑھائے جاتا ہے — ہنسی سے برق کی خود مسکرائے جاتا ہے

ستارہ باریوں سے جگمگائے جاتا ہے فلک کے تاروں کی دنیا چھپائے جاتا ہے
مثالِ چشمِ تمنا کھلے ہوئے تارے
ہٹا جو ابر، تو نکلے ڈھلے ہوئے تارے

وہ رُوح پھُونکی کہ مُردے جلا دیے اس نے بھڑک رہے تھے جو شعلے بجھا دیے اس نے
زمین پہ فیض کے دریا بہا دیے اس نے رُخِ بہار سے، پردے اُٹھا دیے اس نے
گل اپنے جلوۂ رنگیں میں مسکرانے لگے
زمیں ہنسنے لگی، کھیت لہلہانے لگے

سنبھل نہ سکتے تھے، جم کر برسنے والے ابر ہوا کے دوش پہ، لیٹے رہے سنبھالے ابر
زمیں پہ پھینکتے تھے موتیوں کے جھالے ابر وہ نیلی نیلی گھٹائیں، وہ کالے کالے ابر
فلک کی اَبروؤں کی طرح، چڑھ گئے دریا
گھٹا کا زور گھٹا جب، تو بڑھ گئے دریا

جو چاہے وہ، تو اثر کامیاب بنتا ہے خدا ہی جانے کہ کیونکر سحاب بنتا ہے
زمانہ ایک پیم انقلاب بنتا ہے فلک پہ ابر، زمین پر گلاب بنتا ہے
نگاہِ عقل سے دیکھیں، جو حق کے دشمن ہیں
ہر ایک قطرہ میں پنہاں، ہزار گلشن ہیں

ترے وجود میں، اور شبہہ، اے خدا کی پناہ تری عطا کو نہ سمجھے، تو عقل ہے گمراہ
زبان بن گئی کُونپل چمن میں، بے اکراہ کہا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه
سوئے سپہر کشش تھی غضب کی دامن میں
ہزاروں انگلیاں اٹھنے لگیں زمانے میں

تری عطاؤں پہ عقلِ سلیم کا اجماع تھا زیرِ دامنِ گردوں زمیں کا مال و متاع
ہزاروں رنگ سے رنگنے لگی فلک کی شعاع کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَيُعْجِبُ الزُّرَّاع[1]
بنی تھیں سُنبلہ جو بالیاں تھیں دانوں کی
مگر ٹھکانے لگیں محنتیں کسانوں کی

[1] سورۃ الفتح، ۴۸: ۲۹

سحابِ فیض جو برسا، تو بھر گئے جل تھل — یہ انقلاب ہے، یہ تغیر اور یہ ردّ و بدل
یہ ناتوانوں میں قوت ہے دیکھو زورِ عمل — طبق زمین کے اور توڑ دے ہری کونپل

کوئی قوی ہے ضعیفوں کے ساتھ ساتھ ضرور
نمو کے پردے میں پنہاں، ہے کوئی ہاتھ ضرور

غبار میں ہے، مگر دل ہے صاف دانے کا — ہے گردِ کعبۂ قدرت طواف دانے کا
اتار لیتا ہے کوئی غلاف دانے کا — شگافِ خامۂ کُن ہے شگاف دانے کا

زمیں پہ کوششیں قطرِ دل کی کامگار ہوئیں
لٹا جو خاک میں، سر سبزیاں نثار ہوئیں

ترے کرم کے تصدّق، تری عطا کے نثار — تھا تیرا حکم، جب ہی نامیہ تھی برسرِ کار
زمیں کی گود میں لیں کروٹیں ہزاروں بار — اُس ایک دانے سے پورا شجر ہوا تیار

کھلا نہ رازِ در دل ایسے پردہ دار ملے
کسی کو پھول ملے اور کسی کو خار ملے

کسی کو برگ دیئے اور کسی کو بَر بخشا — اِسے اثر نہ دیا، اور اُسے اثر بخشا
اِسے بنا دیا محروم، اُسے ثمر بخشا — خلش کسی کو عطا کی، کسی کو زر بخشا

کسی کے کان میں شبنم کو گوشوارہ کیا
کسی کے دامنِ نازک کو پارہ پارہ کیا

کوئی ہے خشک چمن میں، کوئی تر و تازہ — کسی کے حُسن کا، اونچا فلک سے آوازہ
کسی کا رنگ ہے پھیکا، کوئی ہے پُرغازہ — بُھگت رہا ہے کوئی شاخ کج کا خمیازہ

نہ انتقام کسی نے علی الرؤس لیا
بڑے درختوں نے چھوٹوں کا خون چُوس لیا

ترقیاں ہیں اِسی میں، یہ رازِ فطرت ہے — اصولِ خاص پہ مبنی، ہر اک حقیقت ہے
برت رہا ہے اِسے، وہ جو ربِّ قدرت ہے — نہ اس میں ہے کوئی شکوہ، نہ کچھ شکایت ہے

فنا کے دَور سے گذرے رہِ ثبات ملی
ہزاروں بار مٹے، تب کہیں حیات ملی

جو اِس نے پائی مسرت، تو اُس کو غم بخشا — کسی کو کر دیا بیجان، کسی کو دم بخشا
کسی کو دامنِ بحر، اور کسی کو یم بخشا — کسی کو دے دیا زائد، کسی کو کم بخشا

کھلینگے راز نہ انسان سے مشیت کے
یہی سمجھ لو تصرف ہیں مالکیت کے

فدا جماد ہوا، تب کہیں نبات بنی — نباتِ ارض سے حیواں کی کائنات بنی
ہوا یہ فدیہ، تو پھر آدمی کی ذات بنی — بغیر اس کے نہ دنیا میں کوئی بات بنی

ہر ایک وقت میں اور رنگ، یا ہیئت بدلے
تغیرات ہوئے رنگِ ماہیئت بدلے

جہاں میں منزلِ آخر جماد کی ہے بشر — اب اس کے ہاتھ میں ہے اختیارِ خیر و شر
اِدھر زمیں پہ، اُدھر ہے فلک پہ اس کی نظر — تنزلی اور ترقی میں دونوں ہیں رہبر

یہ چاہے خاک بنے، یا فلک پہ چڑھ جائے
ترقیاں جو کرے، تو ملک سے بڑھ جائے

تغیرات ہوئے، اور کوئی غم نہ ہوا — لبوں پہ آیا کسی کے نہ ایک بھی شکوہ
کبھی نہ اس کے لیے آدمی کا دل تڑپا — خرد نے دیکھ لیا، اور حاسہ نے سُنا

یہ جان دیتی ہے اور جان بنتی جاتی ہے
نبات فدیۂ حیوان بنتی جاتی ہے

نباتِ ارض ہے بیجان، یہ نہ ہو وسواس — ہے اس میں روح نباتی، اسے بھی ہے احساس[٥]
ہے دوستوں سے اِسے اُنس، دشمنوں سے ہراس — فلک کا دیکھتی ہے منہ، لگائے رہتی ہے آس

کب اس کو ظلم کفِ دہر سے ملا نہ کیا
ہزاروں سختیاں جھیلیں، مگر گلا نہ کیا

---

[٥] سر جگدیش بوس ماہرِ نباتات نے اس حقیقت کو سائنس سے ثابت کیا ہے۔

ظلام و نور کا دن رات سے سبق سیکھو ہر ایک ذرّہ کی، ہر بات سے سبق سیکھو
نظامِ دہر کے آیات سے سبق سیکھو خموش رہ کے نباتات سے سبق سیکھو

بغیر سمجھے ہوئے، منہ سے کچھ کہا نہ کرو
مشیّتوں کا نہیں علم، تو گلا نہ کرو

تھا ظرف جتنا بھی جس کا، اُسے وہی بخشا ہنسی گلوں کو ملی، اُوس کو ملا رونا
کہیں ہے رو کشِ تقدیر، پیچ سنبل کا دلِ بہار میں اُترا ہوا کہیں کانٹا

کسی کو رنگ دیا، اور کسی کو بُو بخشی
صدف میں قطرۂ نیساں کو آبرو بخشی

غذا جو پنکھڑیوں کی ہے، وہ شجر کی نہیں کہ جذبِ اصل کی مقدار فرعِ ترکی نہیں
جڑوں کی ریشہ دوانی ہے جو، ثمر کی نہیں ہے اُس کے ہاتھ میں تقسیم اپنے گھر کی نہیں

کمی پہ یہ ہوا قانع، تو اُس کو بیش دیا
کسی کو نوش دیا، اور کسی کو نیش دیا

حکیم وہ ہے، تو مجمل کیا مفصّل کو سپیدی برق کو دی، اور سیاہی بادل کو
کھلاؤ دشت کو بخشا، گھناؤ جنگل کو سمائی اپنے میں پیدا کرو، نہ یوں چھلکو

نگاہِ عقل سے، قدرت کے صرف کو دیکھو
شکایتیں نہ کرو، اپنے ظرف کو دیکھو

محلِ شکوہ نہیں، یہ نظامِ عالم ہے خرد فریب یہاں انتظامِ عالم ہے
کسی کے دستِ قضا میں زمامِ عالم ہے نئے ہیں طرز، عجب صبح و شامِ عالم ہے

کسے سنبھالو گے، جب خود سنبھل نہیں سکتے
چراغ عقل اس آندھی میں جل نہیں سکتے

سلام

راستہ حق کا ہوا ہی کرتا ہے اکثر نیا دیکھنا دیوارِ کعبہ میں بنا اک در نیا
رو کشِ جنّت ہے اشکِ غم سے روئے مومنین آنکھوں ہی آنکھوں میں پیدا کر لیا کوثر نیا

آنے دو معراج کی شب بڑھنے دو شوقِ وصال
راستہ کرلے گا پیدا گنبدِ بے در نیا

رکھ چکے ہیں پاؤں بچپن میں جوانی کی طرح
کب علیؑ کے واسطے ہے دوشِ پیغمبر نیا

دیکھیے دوشِ رسالت پر امامت کا عروج
آج کعبہ میں مؤذن ہے نیا، منبر نیا

حامل رایت تھے کہنہ مشق پلٹے بار بار
اب فاتح ڈھونڈتا ہے قلعۂ خیبر نیا

حق پہ تکیہ فرشِ احمدؐ شام ہجرت اور علیؑ
سونے والا ہے نیا، تکیہ نیا، بستر نیا

خُم کا میداں، دستِ مرسلؐ جامِ بلّغ، دورِ مے
میر امیخانہ نیا، ساقی نیا، ساغر نیا

جُھریوں میں رُخ کی چمکا خطِ تقدیرِ حبیب
غل ہوا تحریر قسمت ہے نئی، مسطر نیا

فاطمہ آئیں عدالت خواہ بن کر زیرِ عرش
اور بپا ہو گیا محشر میں اک محشر نیا

نوکِ نیزہ پر بھی مشغولِ تلاوت ہیں حسینؑ
معجزہ دکھلا رہا ہے یہ سرِ سرورؑ نیا

کانپتے ہاتھوں پہ لے جاتے ہیں بچے کو حسینؑ
دستِ اطہر پر بنا گہوارۂ اصغرؑ نیا

ننھی سی تربت میں رکھ کر لاش کو بے شیر کی
شہ نے فرمایا کہ بیٹا ہو مبارک گھر نیا

بھائیوں کو سامنے کٹوا کے رخصت کے لیے
راستہ کرتا ہے پیدا بازوئے سرورؑ نیا

رو رہا ہوں غم میں شہ کے کھلتے ہیں زخموں کے پھول
آج کے دن سے مری جنت نئی، کوثر نیا

سب کیا کرتے ہیں اے محبوب امدحِ شہ مگر
جب اٹھاتے ہو قلم تم کہتے ہو اکثر نیا

رُباعی

کشتی طاعت کی کھینے والے نہ رہے
خالق سے جزا کے لینے والے نہ رہے

اللہ کے حق کا ذکر کیا دنیا میں
بندوں کے حقوق دینے والے نہ رہے

بگٹٹ عظیم آبادی، غلام دستگیر خان

پٹنے کے ایک متوسط الحال، زمینداری پیشہ پٹھان خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد عبدالکریم خان (عرف میاں خان صاحب) تھے۔ بگٹٹ ۱۹۰۳ء میں اپنے آبائی مکان واقع محلہ لودی کٹرہ (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ رسمی تعلیم دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ امتحان ۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ پٹنہ سٹی اسکول سے پاس کیا۔ اس کے بعد اگرچہ کالج میں داخلہ تو لیا، لیکن حالات کی نامساعدت کے باعث یہ سلسلہ چل نہ سکا۔ دو سال بعد ۱۹۲۲ء میں سرکاری ملازمت مل گئی۔ اس میں بھی کوئی خاص ترقی نہ کرسکے؛ جب پنشن پر سبکدوش ہوئے ہیں، تو سرٹیفکیٹ آفس میں ہیڈ اسسٹنٹ تھے۔

شعر سے دلچسپی تعلیم کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ کلام پر اصلاح غالباً پرویز شاہدی (ف مئی ۱۹۶۸ء) سے لی۔ جب موصوف ۱۹۳۵ء میں کلکتے چلے گئے، تو سید جمیل مظہری کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ کلام میں، جیسا کہ تخلص سے عیاں ہے، مزاح کا پہلو غالب ہے۔ دورِ حاضر کے سیاسی اور معاشی مسائل پر طنز اور استہزاء ان کا خاص حصّہ تھا۔ افسوس کہ کوئی مجموعۂ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو عید الفطر کا دن گزار کر سرِ شام رہگرائے عالمِ جاودانی ہو گئے۔ عارضۂ دل کا شکار ہوئے۔ پہلی بیوی سے ایک صاحبزادی اور دوسری سے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی اپنے سوگواروں میں چھوڑے۔

بہت مشکل سے ان کے چند شعر ملے ہیں، وہی بطور نمونہ ذیل میں درج کر رہا ہوں؛

رُباعی

چینی کی ہے بڑھتی ہوئی قیمت، بگنٹ ! . بازار میں گڑ تک کی ہے قلت، بگنٹ !
کیا کروں یار سے تلخ کلامی کا گلہ ! پھیکا ہی ملا وصل کا شربت، بگنٹ !
ہے خرچ کی چیز، پان کھانا چھوڑو بجلی ہونٹوں سے اب گرانا چھوڑو
جاسوس محلّے میں بہت ہیں، بیگم ! لگ جائیگا ٹیکس مسکرانا چھوڑو

قطعہ

سمجھ میں کچھ نہیں آتا محبّت کس کو کہتے ہیں
نتیجہ یہ نکلتا ہے، جو ہم ریسرچ کرتے ہیں
یہ اک وائر ہے، جس میں ہے کرنٹ "اے سی" "ڈی سی" کا
کسی سے ہٹ کے مرتے ہیں، کسی سے سٹ کے مرتے ہیں

غزل

بھوک میں رخصت تبسّم ہو گیا میں شہیدِ ہجرِ گندم ہو گیا
خط میں کچھ مانگا تھا گیہوں یار نے نامہ بر جا کر کہاں گم ہو گیا
ملتے ملتے رہ گیا کل یار سے بوسہ امریکا کا گندم ہو گیا
شاپ پر راشن کے اتنی بھیڑ تھی یار سے میرا تصادم ہو گیا
ملک میں کچھ کم نہ تھا غلّہ، مگر سیٹھ جی کے توند میں گم ہو گیا

عشق میں اپنا پروموشن ہوا
ان کا بگنٹ "آپ" سے "تم" ہو گیا

اَبراحسنی گنوری، احمد بخش

مئی ۱۸۹۸ء میں یوپی کے پرانے تاریخی قصبے گنوّر (ضلع بدایون) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ نبی بخش ایک متوسط الحال کاشتکار تھے اور یہی ماحول انھیں بھی ملا۔ والد کا انتقال ان کی کمسنی میں ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت کا بار ان کی والدہ (محبوب النساء بیگم) کے کندھوں پر آپڑا، جسے اس حوصلہ مند خاتون نے بڑے سلیقے سے اٹھایا۔

تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق، مقامی مکتب سے شروع ہوئی۔ یہاں اردو کی ابتدائی کتابوں کے علاوہ قرآن بھی پڑھا۔ پھر ۱۹۱۶ء میں گنوّر کے مڈل اسکول سے آٹھویں درجے میں کامیاب ہوئے۔ گھر کے ناسازگار حالات کے باعث مزید تعلیم ممکن نہیں تھی، اس لیے انھوں نے ملازمت کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، اور کانپور کے مشہور جوتوں کے سرکاری کارخانے میں ملازم ہوگئے۔

اس زمانے میں منشی سخاوت حسین سخا شاہجہاں پوری بھی اسی کارخانے میں ملازم تھے۔ ابر صاحب نے اگرچہ شعر گوئی ۱۹۱۵ء میں اپنے قیام گنوّر کے زمانے ہی میں شروع کردی تھی، لیکن اب تک کسی سے اصلاح نہیں لی تھی۔ یہاں کانپور میں ان کی سخا سے ملاقات ہوئی، تو یہ ان سے مشورہ کرنے لگے۔ اس لیے کہنا چاہیے کہ ان کی باقاعدہ شاعری کا آغاز ۱۹۱۶ء ہی میں ہوا۔ ابر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میرا ایک کاروباری معاملے میں سخا سے اختلاف ہوگیا تھا جس کے بعد ان سے اصلاح کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ حقیقت اس سے زیادہ ہے۔ ہوا یہ کہ جب ٹریننگ کالج کی سند لے کر ابر صاحب قادری باغ کے (جسے اب چمن پور کہتے ہیں) پرائمری اسکول میں مدرّس ہوئے، تو یہاں ان کی راز سہسوانی سے اکثر ملاقات

رہنے لگی، جنھیں وہ پہلے سے جانتے تھے۔ راز شعر میں سید علی احسن، احسن مارہروی (ف ۱۹۴۰ء) کے شاگرد تھے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، احسن خود داغ (ف ۱۹۰۵ء) کے ممتاز شاگرد اور ان کے نورتنوں میں شامل تھے۔ اس زمانے میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سینیئر لیکچرر تھے۔ راز کی ترغیب پر ابر صاحب نے احسن کا تلمذ اختیار کر لیا۔ تلمذ کا یہی تعلق ان کے اپنے تخلص کے ساتھ احسنی کی نسبت کے مستقل اضافے کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد سخا شاہجہان پوری سے اصلاح لینا بند کر دی۔

تقریباً چار برس کی ملازمت کے بعد ابر صاحب کانپور سے گنور واپس آ گئے۔ چونکہ وہ جُفت سازی کے کارخانے میں تین چار سال کام کر چکے تھے، انھوں نے خیال کیا کہ وہ اس کاروبار کے ماہر ہو گئے ہیں۔ اسی غلط فہمی میں انھوں نے یہاں وطن میں جوتوں کی دکان کھول لی۔ یہ تجربہ بالکل ناکام رہا۔ گنور میں انگریزی جوتے (بُوٹ) کا رواج ہی نہیں تھا، سب لوگ مقامی ساخت کا نری کا جوتا پہنتے تھے۔ لیکن اس سے بھی بڑی مشکل یہ تھی کہ کسی کو جوتا تیار کرتے دیکھنا، ایک بات ہے اور خود جوتے بیچنا، بالکل دوسری! دونوں کا بھلا آپس میں کیا تعلق! نتیجہ یہ نکلا کہ تجارت کا تجربہ نہ ہونے کے باعث سال بھر میں ساری پونجی کھو بیٹھے۔

اب انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ مولانا حکیم عبدالحکیم کامل گنوری سے فارسی اور عربی پڑھنے لگے۔ فارسی انھوں نے مولوی رفیع احمد عالی بدایونی (پروفیسر ضیا احمد بدایونی کے والد) سے بھی پڑھی۔ تیاری کے بعد اردو اور فارسی کے امتحان پاس کیے۔ غرض، ان اسناد کے بل بوتے پر انھوں نے محکمۂ تعلیم کا دروازہ کھٹکھٹایا اور احباب کی سفارش سے انھیں ڈسٹرکٹ بورڈ میں تعلیمی نوکری مل گئی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک وہ ضلع بدایوں کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے، اگرچہ اس میں کا زیادہ زمانہ خاص بدایون شہر میں گزرا، جہاں وہ ۱۷ سال رہے۔ اسی باعث وہ بدایون کو اپنا "وطنِ ثانی" کہا کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا؛ اور اسی کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات بھی آئے، جن سے

ملک کا امن تباہ ہو گیا۔ ابر صاحب اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر رامپور چلے گئے۔ یہاں ان کے شاگرد سید محسن علی حشر ریاست کے محکمۂ تعلیم میں آفس سپرڈنٹ کے ذمہ دار عہدے پر متمکن تھے۔ انھیں کی وساطت سے ابر صاحب کے داماد افسر حسین افسر گنّوری اور بڑے صاحبزادے طریقت حسین تابش پہلے سے رضا ٹکسٹائل کارخانے میں ملازم ہو کر رامپور جا چکے تھے۔ اب حالات سے مجبور ہو کر ابر بھی اپنے بیٹے کے پاس رامپور پہنچے۔ حشر صاحب کو معلوم ہوا، تو انھوں نے فوری طور پر انھیں ایک شبینہ اسکول میں ملازم کرا دیا؛ پھر مناسب کارروائی مکمّل کر کے مدرسۂ عالیہ (اورنٹیل کالج) میں ۷۵ روپے مشاہرے پر جگہ دلوادی۔ رامپور میں پانچ برس رہے؛ اور وہاں سے ۱۹۵۳ء میں سبکدوش ہو کر گنّور واپس چلے آئے۔

جب سیّد احسن مارہروی کا اگست ۱۹۴۰ء میں انتقال ہوا ہے، تو انھوں نے گنّور میں استاد کے نام پر "بزمِ احسن" قائم کی تھی۔ وہ خود اس کے صدر تھے۔ اس بزم کے زیرِ اہتمام وہ مشاعرے وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ اب رامپور آنے کے بعد انھوں نے استادِ گرامی کی یاد میں اپنے استاد بھائی صغیر احسنی مظفر نگری کے اشتراک سے ماہنامہ "احسن" جاری کیا۔ اس کا اس زمانے کے موقّر پرچوں میں شمار ہوتا تھا۔ جب تک رامپور رہے، احسن بھی شائع ہوتا رہا؛ ان کے ترکِ رامپور کے ساتھ ہی یہ بند ہو گیا۔ یوں بھی یہ گھاٹے کا سودا تھا؛ جو ان کے شاگرد اور احباب چندہ جمع کر کے پورا کرتے رہتے تھے۔

رامپور سے واپس آنے کے بعد انھوں نے بسر اوقات کے لیے آبائی پیشہ کاشتکاری اختیار کیا۔ ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ آیندہ شاگردوں کو اپنے کلام پر اصلاح کے لیے کچھ نہ کچھ پیش کرنا ہوگا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ہم ہر ایک خدمت کے لیے کام کرنے والوں کو اجرت دیتے ہیں؛ بازار سے کوئی چیز خریدتے ہیں، تو اس کی بھی قیمت ادا کرتے ہیں۔ استاد بھی کلام کی اصلاح میں اپنا وقت خرچ کرتا ہے، اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں سے شاگرد کی تربیت کرتا ہے؛ پس اسے معاوضے سے کیوں محروم رکھا جائے! اس کے علاوہ باہر کے مشاعروں میں بھی ان کی بہت مانگ تھی؛ اور اس سے بھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ مزید برآں ۱۹۶۲ء

میں یو پی حکومت نے ان کا چھ سو روپے سالانہ ادبی وظیفہ مقرر کر دیا۔ غرض یہ کہ اگرچہ اب وہ کہیں ملازم نہیں تھے، لیکن مادی پہلو سے انھیں کسی پریشانی کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی؛ ان کے ذاتی خرچ کے لیے ان کے پاس کافی وسائل تھے، بلکہ اپنی محتاط زندگی اور حد درجہ کفایت شعاری کے باعث وہ یقیناً کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے کے قابل رہے ہونگے۔

گنور میں وہ اپنی دو خُرد سال پوتیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ۷ نومبر ۱۹۷۳ء شب کے کھانے کے بعد وہ حسبِ معمول اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اگلی صبح (۸ نومبر) جب وہ دیر تک باہر نہیں نکلے، تو تقریباً آٹھ بجے ان کی بڑی پوتی ان کے کمرے میں گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ خون میں لت پت مُردہ پڑے ہیں۔ شب میں انھیں کسی نے قتل کر دیا تھا۔ قتل کا سبب معلوم نہ ہوسکا؛ نہ قاتلوں ہی کا کوئی سراغ ملا۔ لاش اسی دن پوسٹ مارٹم کے لیے بدایوں گئی۔ جنازہ اگلے دن یعنی ۹ نومبر ۱۹۷۳ء کو اٹھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں گنور میں پرانی سرائے کی پشت پر آبادی کے قریب کچھ زمین اپنے خاندانی قبرستان کے لیے خریدی تھی؛ اس کا نام "گلستانِ جاوید" رکھا تھا؛ اسی میں دفن ہوئے۔

ان کی ۱۹۱۹ء میں اِیکری (ضلع بدایوں) میں شادی ہوئی تھی۔ چار بیٹے (طریقت حسین، ودیعت حسین (عرف مناظر حسین)، نزہت حسین، غنی باقر عرف اچھّن میاں) اور ایک بیٹی (مدینہ بیگم) ان سے یادگار رہیں۔ مدینہ بیگم اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان چلی گئی تھیں۔ چاروں بیٹے یہیں ہندستان میں رہے اور سب خوش و خرّم ہیں۔ بیوی (عائشہ بیگم) کا انتقال ان سے سال بھر قبل ۲۸ نومبر ۱۹۷۲ء کو ہو گیا تھا۔

اس میں شبہہ نہیں کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج میں ابر احسنی کی خدمات بہت قابلِ قدر رہی ہیں۔ ان کے سینکڑوں شاگرد ملک کے دور دراز خطوں تک میں ملتے ہیں، اور وہ اپنی اپنی جگہ اردو کا عَلَم بلند کیے ہوئے ہیں۔

ابر مدّتوں مشہور تعلیمی ماہنامے "رہنمائے تعلیم" کے ادارۂ تحریر میں بھی شامل رہے۔ ان کی فنّی اور لسانی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اس سلسلے میں ان کی سیماب اکبرآبادی (ف ۱۹۵۱ء) سے چپقلش قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے سیماب صاحب کی کتاب "دستور الاصلاح"،

میں درج شدہ تمام اصلاحوں کا تفصیلی جائزہ لیا تھا، جو رہنمائے تعلیم میں تقریباً تین برس قسط وار شائع ہوا۔ یہ مضامین کتابی صورت میں "اصلاح الاصلاح" کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔

اسی نوع کا دوسرا مناقشہ نیاز فتحپوری سے پیش آیا تھا۔ نیاز نے کسی زمانے میں "مالہٗ و ما علیہٗ" کے عنوان کے تحت نگار میں مختلف اساتذہ کے کلام پر تنقید لکھنا شروع کی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے احسن مارہروی کے کلام کو بھی لے لیا۔ ابر اپنے اُستاد کے عاشق تھے؛ قدرتاً انھیں یہ تنقید (بلکہ تنقیص) بہت ناگوار گزری، انھوں نے اُستاد کی حمایت میں نیاز کے اعتراضوں کا جواب دیا۔ نیاز بھی بلائے بے درماں تھے، اور ان کا مبلغِ علم و فن بھی ابر سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ سلسلہ بھی بہت دن چلا۔

ابر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ان کی تبدیلِ مذہب ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شروع میں قرآن پڑھا۔ مدّتوں نعت اور منقبت لکھتے رہے؛ ان کا ایک دیوان (شبینے) اسی صنعتِ کلام کا مجموعہ ہے۔ لیکن بعد کو وہ بہائی ہو گئے۔

قصّہ یوں ہے کہ جس زمانے میں ابر صاحب گنوّر میں مقیم تھے، ایک صاحب بلاک ڈیولپمنٹ کے محکمے میں ملازم ہو کر جباؤنی (تحصیل گنوّر) آئے۔ ابر کا ان کے ہاں آنا جانا ہو گیا۔ وہاں اُن کے والد ارتضیٰ حسین عابدی سے ملاقات ہوئی۔ عابدی صاحب بھی تعلیمی ملازمت میں رہے تھے، اور پرنسپلی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ مذہباً بہائی تھے۔ ابر صاحب کی ان سے صحبت رہنے لگی جس میں لا محالہ مذہب پر بھی گفتگو ہوئی۔ انھیں کی ترغیب و تشویق پر اور اثر کے تحت ابر نے بھی بہائی مذہب اختیار کیا۔

ان کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:

(۱) اصلاح الاصلاح (رامپور ۱۹۴۹ء)؛ (۲) سفینے: نظمیں (رامپور ۱۹۵۲ء)؛ (۳) نگینے: غزلیات (رامپور ۱۹۵۲ء)؛ (۴) میری اصلاحیں: دو حصے (دلّی ۱۹۵۶ء؛ ۱۹۶۶ء)؛ (۵) قرینے: غزلیات (جالندھر ۱۹۶۳ء)؛ (۶) شبینے: حمد و نعت و سلام (دلّی ۱۹۶۶ء)؛ (۷) خزینے: غزلیات، نظمیں، متفرقات (دلّی ۱۹۶۹ء)۔ بہت سا کلام ہنوز زیورِ طبع

سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس میں غزلیات اور منظومات کے علاوہ ایک پورا مجموعہ بہائیت سے متعلق بھی ہے۔

ابر کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ جو کچھ اساتذہ سے سیکھا، وہ تو تھا ہی، اس پر انھوں نے عمداً اپنے آپ کو متروکات کی ایک لمبی فہرست کا بھی پابند بنا لیا تھا، جن میں سے بعض معقول ہیں، بعض غیر ضروری؛ بہر حال وہ ان پر قائم تھے۔ ان کے استاد احسن مارہروی فنِ شعر کے پورے ماہر تھے؛ ابر نے یہ ان سے حاصل کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فن اور زبان کے پہلو سے ان کے کلام میں کوئی سقم نہ رہا۔ وہ ایک دیندار مسلمان گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس لیے وہ کسی عریانی اور بیراہروی کے روادار نہیں ہو سکتے تھے۔ بہائی مذہب اختیار کیا، تو وہاں بھی اخلاق کی پابندی جوں کی توں قائم رہی۔ غرض ان کے ہاں آپ کو اخلاق اور تہذیب سے فروتر کوئی شعر تلاش کرنے پر بھی نہیں ملیگا۔

ان کے مطبوعہ سے قدرِ اوّل کے اشعار کا اچھا انتخاب تیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مجموعے آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں، اس لیے نمونے کے طور پر چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں:

چند دن رہ لے، قفس بھی آشیاں ہو جائیگا ۔۔۔ وقت خود مانوس کر دیتا ہے، اے تازہ اسیر

عنواں بدل بدل کے سنایا نہ جائیگا ۔۔۔ ہم سے تو اپنا قصۂ غم، غیر کی طرح

آستیں سِل نہ چکی تھی کہ گریباں نکلا ۔۔۔ جامہ دوزی مری وحشت میں کوئی کیا کرتا

جس کو میں بھی کہہ نہ سکوں، جس کو وہ بھی سن نہ سکیں

حال وہیں تک آپہنچا، در دبھرے افسانوں کا

اب یہ خدا کو علم ہے، کس نے مجھے مٹا دیا ۔۔۔ آپ تو خیر دوست ہیں، دل سے بھی دشمنی نہ تھی

ہمیں تو جستجو سے واسطہ رکھنا، جدھر جانا ۔۔۔ حرم میں، دیر میں، کیا فرق ہے، یہ کم نظر دیکھیں

ہمیں، اے ابر گلشن چھوڑ کر اپنا کدھر جانا ۔۔۔ بلا سے برق کوندے، آگ برسے، آندھیاں آئیں

ہر اک دھڑکن سے دل کی، دوست کا مجھ کو پیام آیا

محبت میں، خدا اے آرزو! یہ کیا مقام آیا

بہت سے مرحلے کرنے پڑے طے کوئے جاناں میں
کبھی بیت الصنم آیا، کبھی بیت الحرام آیا

لکھ رہا ہوں نامۂ شوق ان کو یوں
جیسے آہی جائیگا اس کا جواب

مجھ کو جلووں کی، ان کو نظر کی طلب
عشق بھی تشنہ لب، حسن بھی تشنہ لب

غالباً آ گئے دن فصلِ بہاراں کے قریب
ہاتھ رک جاتے ہیں آ آ کے گریباں کے قریب

دیے آئی ہے موت غم سے نجات
کس کو ملتا ہے اب مزاجِ حیات

روز ہوتے ہیں راہبر پیدا
روز لٹتے ہیں کاروانِ حیات

نہ سنبھالے جنونِ عشق اگر
عقل برباد کر چکی تھی حیات

ل نہیں سکتی غم سے نجات
عمرِ محبت تا بہ حیات

داغِ الفت دل میں، جلوے آنکھ میں، سر میں جنوں
ایک دنیا لے کے اٹھے ہیں، تری محفل سے ہم

ہم نے جہانِ عشق میں کاٹی ہے زندگی
آگاہ شام سے ہیں، نہ واقف سحر سے ہم

یہ بارہا ہوا ہے کہ ان کے خیال میں
رودادِ ہجر کہتے رہے بام و در سے ہم

نام اُن کا سن کے یوں کھوئے کہ ہر اک پا گیا
جب کبھی بہکے ہیں، بہکے ہیں اسی منزل سے ہم

آغازِ محبت کے انجام کو کیا کہیے
جب درد کا شکوہ تھا، اب جان کے لالے ہیں

دل میں ہے سوزِ عشق تصوّر میں حُسنِ دوست
دوزخ ہے میرے سینہ میں، جنت نگاہ میں

سجدوں سے لاکھ ڈر کے اسے مل گئی نجات
سر جس کا آ گیا ترے در کی پناہ میں

میرے مرنے کا موت پر الزام
کام جس کا ہے، اس کا نام نہیں

عزیز اس سے تو ہم نے دین و ایماں بھی نہیں رکھا
اب آگے جو کچھ آئے بیوفا کے دین و ایماں میں

مرے نالوں کا کیوں چرچا کہ میں تو ایک انساں ہوں
پڑیں چوٹیں، تو اڑتے ہیں شرارے سنگ و آہن سے

تڑپا گیا قفس میں چمن کا دھواں مجھے
بجلی کہیں گری ہے، ہوا ہے اثر کہیں

ہستی میں میری عشق میں ڈالے ہیں تفرقے
میں ہوں کہیں، خیال کہیں، ہے نظر کہیں

اہلِ خرد کی وحشت دیکھو　　دیوانہ تو پھر دیوانہ

فسانہ میرا سُن لو آج، ورنہ　　سنو گے کل یہ دنیا کی زباں سے

تم یاد بھی رکھو گے، ستم بھی نہ کرو گے　　اس کا بھی یقیں ہے مجھے، اُس کا بھی یقیں ہے

فسانہ زندگی کا یوں بھی کم دلکش نہ تھا، لیکن　　لگے چار چاند اور اس میں عنوانِ محبت سے

اک ترا لطف، ایک تیرا ستم　　میری موت و حیات کچھ بھی نہ تھی

صرف حسنِ خیال تھا میرا　　نگہِ التفات کچھ بھی نہ تھی

دل کو تڑپ کے تھام لیا ہے کبھی کبھی　　یوں بھی تمہارا نام لیا ہے کبھی کبھی

بادل میں بجلی لہرائی　　کس کافر نے لی انگڑائی

دکھنے لگا دل سرد آہوں سے　　اُبھری چوٹ، چلی پُروائی

ترے سوزِ ہجر نے پھونک دی چمنِ مراد کی ہر کلی
فقط ایک شاخِ وفا ہی تھی جو بہ فیضِ عشق ہری رہی

غم سے گھبرا کر آہ کون کرے!　　عشق میں یہ گناہ کون کرے!

آپ سے رسم و راہ کون کرے!　　عمر بھر آہ آہ کون کرے!

پُرسکوں فقر کے بھی لالے ہیں　　طلبِ عزّ و جاہ کون کرے!

محو ہوں درد کی لطافت میں　　کس کو فرصت ہے آہ کون کرے!

اُن کی نظریں جدھر، اُدھر دنیا　　میری جانب نگاہ کون کرے!

ترکِ اُلفت! ارے، معاذ اللہ!　　اپنی ہستی تباہ کون کرے!

سب مسرت طلب ہیں دنیا میں
ابرائم سے نباہ کون کرے!

سلام مچھلی شہری، عبدالسلام

یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو مچھلی شہر (ضلع جونپور) کے محلے مولویانہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کا متوسط الحال خاندان پشتوں سے مقیم تھا۔ خاندان میں علمی روایت تھی چنانچہ ان کے جدِّ امجد مولوی محمد اسمٰعیل جونپوری کی عالم حدیث کی حیثیت سے خاصی شہرت ہے۔ اس کے باوجود سلام کے والد محمد عبدالرزّاق نے کپڑے کا کاروبار اختیار کیا۔ وہ بمبئی سے ایجنسی پر مال منگواتے اور اسے مچھلی شہر اور مضافات میں فروخت کرتے تھے۔ محمد عبدالرزاق صاحب چاہتے تھے کہ بیٹا علوم دین میں فاضل بنے؛ چنانچہ عبدالسّلام کو پہلے قرآن حفظ کرایا گیا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ بورڈ اردو مڈل اسکول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۵ء میں آٹھویں درجے کا نتیجہ اتنا اچھا رہا کہ سرکاری وظیفہ ملا۔ اب یہ فورلبس ہائی اسکول، فیض آباد میں آگئے، لیکن دسویں کے امتحان میں ناکام رہے۔ یہ امتحان انھوں نے بعد کو ۱۹۳۹ء میں پرائیوٹ طور پر پاس کیا۔ باقاعدہ تعلیم اسی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ البتہ اس کے بعد اردو کے بعض امتحانات غیر رسمی طور پر پاس کر لیے تھے۔

وہ ابھی طالبعلم تھے کہ نظم و نثر لکھنے لگے۔ بلکہ انھیں ایّام میں انھوں نے ایک رسالے "نغمہ" کی ادارت بھی کی، جو فیض آباد سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ افسوس کہ یہ جلد ہی مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ اس کے صرف پانچ شمارے شائع ہوئے (نومبر ۱۹۳۸ء، دسمبر ۱۹۳۸ء، جنوری ۱۹۳۹ء، فروری ۱۹۳۹ء، مارچ و اپریل ۱۹۳۹ء: مشترکہ شمارہ) اسی زمانے میں انھوں نے نظم میں متین مچھلی شہری (تلمیذ داغ دہلوی) سے اصلاح لینا شروع کی۔ لیکن چونکہ دونوں کا مزاج بالکل مختلف تھا، جلد ہی یہ تعلق منقطع ہوگیا؛ لیکن بعض دوسرے

اصحاب کی طرح انھوں نے کبھی استاد کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا، نہ ان سے اصلاح لینے کے واقعے کو غلط بتایا۔

۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ "میرے نغمے" کے عنوان سے مرتّب کیا؛ یہ اگلے برس ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ اس میں کلام دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا حصّہ "پھول" تھا، جس میں رومانی اور جذباتی نظمیں اور گیت تھے؛ دوسرے حصّے "انگارے" میں غالباً سیاسی موضوع کی منظومات تھیں۔ اردو سوسائٹی لکھنؤ (ناشر) کی ایک تحریر سے جو کتاب کے آخر میں چھپی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے ہنگامی حالات کے پیشِ نظر انھوں نے ان سیاسی نظموں کو کتاب سے حذف کر دینا قرینِ مصلحت خیال کیا۔ افسوس اس امر کا ہے کہ بعد کو بھی یہ کہیں شائع نہ ہوئیں اور بگمانِ غالب ضائع ہو گئیں۔

ملازمت کا آغاز الٰہ آباد یونیورسٹی کے کتابخانے سے ہوا۔ ۱۹۴۲ء میں یہاں کے مشرقی شعبے میں کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق پہلے سے تھا، اس ملازمت نے اس پر جلا کی؛ یہاں انھیں اپنی معلومات اور قابلیت کے بڑھانے کے مواقع میسّر آئے۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے، اور شروع میں اس کے لکھنؤ دفتر میں کام کرتے رہے۔ انھیں ایّام میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے اردو رسالے "مضراب" کے مدیرِ اعزازی مقرّر ہوئے تھے۔ لکھنؤ میں آٹھ برس تک کام کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں ان کا سرینگر تبادلہ ہو گیا؛ یہاں ان کے ذمّے فیچر لکھنے کا کام تھا۔ چونکہ یہاں وہ عارضی مستعار خدمت پر آ گئے تھے، اس لیے میعاد کے ختم ہونے پر لکھنؤ واپس چلے گئے، اور بالآخر تبادلے پر دلّی چلے آئے۔ یہاں شروع میں اردو مجلس کے شعبے میں رہے؛ آخری ایّام میں "اردو سروس" میں پروڈیوسر کے عہدے پر فائز تھے۔

دلّی کے قیام کے زمانے میں ان کی کئی چیزیں شائع ہوئیں۔ دوسرا مجموعۂ کلام "وسعتیں" مکتبۂ اردو، لاہور نے شائع کیا، جو ترقی پسند مصنّفین کی کتابیں شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں پیش پیش تھا۔ ۱۹۴۳ء میں دلّی سے گیتوں کا مجموعہ "پائل"، ساقی بکڈپو

نے پیش کیا۔ اسی دور میں ایک ناولٹ "بازو بند کھل کھل جائے"، لکھنؤ میں چھپا۔ ۱۹۶۵ء میں انجمن ترقی اُردو ہند دہلی گڑھ نے ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا۔ ۱۹۷۳ء کے یومِ جمہوریت کے موقع پر انھیں ادبی خدمات کے اعتراف میں "پدم شری" کا اعزاز دیا گیا تھا۔

انھیں بھی اپنے کئی ہمعصروں کی طرح مئے نوشی کی بُری لت تھی۔ اس نے ان کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا۔ وسط ۱۹۷۳ء میں صحت بہت خراب ہو گئی، تو اسپتال میں داخل ہوئے۔ علاج معالجے سے حالت کچھ رُوبااصلاح ہوئی، تو واپس مکان پر آ گئے۔ لیکن طبیعت اچانک پھر خراب ہو گئی۔ بظاہر وہ شدید یرقان کے مریض تھے۔ اب ڈاکٹروں نے جگر پر عمل جرّاحی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۲ نومبر کو آپریشن ہوا، تو کھلا کہ انھیں جگر کا کینسر ہے۔ اس کے بعد وہ پورے ہوش میں ایک دن بھی نہیں رہے۔ اسی حالت میں ۱۹ نومبر (۱۹۷۳ء) صبح پونے آٹھ بجے راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ لاش گھر لائی گئی۔ اسی دن ۵ بجے شام جنازہ اٹھا اور انھیں بہادر شاہ ظفر مارگ پر کوٹلہ فیروز شاہ کے قریبی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں ان کی شادی سوائمتہ (ضلع الٰہ آباد) کے بخشی محمد احمد مرحوم کی صاحبزادی رابعہ خاتون سے ہوئی تھی۔ اپنے پیچھے سات بچے چھوڑے: پانچ بیٹیاں (نسرین، پروین، یاسمین، تزئین، شیرین) اور دو بیٹے (انجم، انور)۔ حکومتِ ہند نے سلام مرحوم کی دیرینہ خدمات کے پیشِ نظر خاندان کو تین ہزار روپے یکمشت عطا کیے تھے اور دو سو روپیا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

سلام کے کلام کی فضا رومانی ہے۔ وہ بڑے "آدرش وادی" اور محبِ وطن تھے۔ اسی لیے بعض حلقوں میں وہ مدّتوں "شاعرِ رومان" کے لقب سے مشہور رہے۔ نمونے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

آسماں! اب بھی تجھے ہم پہ یقیں ہے کہ نہیں
دیکھ جنّت سے بھی دلکش یہ زمیں ہے کہ نہیں!

زہرۂ ہند بہ ایں حسنِ شعورِ تزئین
آج پہلے سے بھی کچھ اور حسیں ہے کہ نہیں!

پانوؤں میں "راس کماری" کی سہانی پازیب — "کاشمر" صورتِ افشاں جبیں ہے کہ نہیں!
کھیتیاں کہکشاں کی صبح و خورشید کے باغ — رشکِ فردوس ہماری یہ زمیں ہے کہ نہیں!
عہدِ ایٹم میں جسے ڈھونڈ رہی ہے دنیا — وہ سکونِ دلِ بیتاب یہیں ہے کہ نہیں!
وہ جو تھا چند برس پہلے اسیرِ مغرب — وہی مستقبلِ مشرق کا امیں ہے کہ نہیں!

زرفشاں ہوتے ہوئے آٹھویں منزل میں سلام!
اور بھی "پریم سہ رنگ" حسیں ہے کہ نہیں!

لاکھ انگڑائی لو، اب چاند کو چھونے کے لیے — خود تو کھلنے سے رہے بندِ قبا میرے بعد
یوں تو کھلتے بھی ہیں، ہنستے بھی ہیں گلزار میں پھول — کوئی طوفانِ بہاراں نہ اٹھا میرے بعد
اے تقاضائے غمِ دہر! میں کیسے آؤں — لذتِ دردِ غمِ یار کو کیسے چھوڑوں
میں خزاں میں بھی پرستار رہا ہوں اس کا — موسمِ گل میں چمن زار کو کیسے چھوڑوں
آج تو شمع ہواؤں سے یہ کہتی ہے، سلام! — رات بھاری ہے، میں بیمار کو کیسے چھوڑوں

دور ہو دنیا سے میری، یا دیکھو بھالو، سیر کرو
اس میں اجڑے جنگل بھی ہیں اور حسیں نظارے بھی
میرے دل کی رنگیں راتیں، میرے دل کے غمگیں دن
جلوہ فگن ہیں داغ بھی اس میں، روشن چاند ستارے بھی
جی میں آئے، رو سکتے ہو؛ جی میں آئے، ہنس بھی لو
یاں موتی کی لڑیاں بھی ہیں اور آنسو کے دھارے بھی
چاہوں یہ آکاش سجا دوں؛ چاہوں، اس کو پھونک بھی دوں
دوڑ رہی ہے برقِ تپش بھی، کھیل رہے ہیں تارے بھی
چاہے، بڑھتی پینگیں دیکھو؛ چاہے آکر سوگ کرو
آنسو کی ساون رت بھی ہے، الفت کے گہوارے بھی
چاہے، دیپک راگ سناؤں؛ چاہے چھیڑوں پریم کے گیت
دل میں دکھ کے مارے بھی ہیں، پہلو میں دھیارے بھی

میری دنیا، کیسی دنیا، کیا جانو اس دنیا کو!
اس میں دکھ کے آنسو بھی ہیں، اس میں چاند ستارے بھی

جاگ رہا ہوں نیند میں، آنکھ کھلے گی بعدِ مرگ — ہستیِ بے ثبات بھی، ایک عجیب خواب ہے
اس چمن میں، آہ! کب شادی و غم مدغم نہیں — خندہ ہائے گل پہ کس دن گریۂ شبنم نہیں
اللہ اللہ، وسعتِ ذوقِ نگاہ! — ایک عالم پر گمانِ جلوہ گاہ
مجھ کو شوقِ بیانِ حالِ فراق — ان کو نفرت فسانۂ دل سے
ہمّت، اے شوق! اور چار قدم — ہو رہا ہوں قریب منزل سے

ذمّہ مرا جو جانِ تصوّر بنا نہ دو
میرے تصوّرات کو کچھ آسرا تو دو

ذیل کی غزل انھوں نے آپریشن سے ایک دن پہلے ۱۲ نومبر ۱۹۷۳ء کو کہی تھی۔ یہ غالباً ان کا آخری کلام ہے:-

وہ چشمِ ناز مری سمت یوں اٹھی ہے کہ، ہائے!
اک ایسی چوٹ دلِ زار پر لگی ہے کہ، ہائے!
کبھی ہنسا تھا رُخِ گل پہ دیکھ کر شبنم
ابھی تلک مری پلکوں پہ وہ نمی ہے کہ، ہائے!
تمام شہر بظاہر حسین ہے، لیکن
تمام شہر میں کچھ ایسی بے لبسی ہے کہ، ہائے!
مجھے بھی دیکھ کے محفل میں یوں تو ہیں، مغرور
بظاہر ایسا اک اندازِ بیرخی ہے کہ، ہائے!
میں چھیڑتا تو ہوں ہر بار اک نیا نغمہ
صدائے ساز کچھ ایسی دبی دبی ہے کہ، ہائے!
وہ اور ہوں گے جنھیں میکدہ مبارک ہے
مرے لیے تو وہ انجامِ میکشی ہے کہ، ہائے!

یہی کہا تھا کہ تم شہرِ دل کی ملکہ ہو
بس اتنی بات پہ کچھ ایسی برہمی ہے کہ، ہائے!
تمام شہر میں ہے شورِ انقلاب، سلام!
تمام چہروں پہ ایسی فسردگی ہے کہ، ہائے!

مرحوم کبھی کبھار فارسی میں بھی کہہ لیتے تھے۔ ان کے کلام میں ہندستان کے دوسرے فارسی گویوں سے کچھ مابہ الامتیاز نہیں ہے؛ لیکن چونکہ یہ غزل انھوں نے ایک موقع پر مجھے دی تھی، میں اس خیال سے اسے یہاں نقل کر رہا ہوں کہ محفوظ ہو جائے:

بہارِ گلفشاں آمد، نشاطِ قلب وجاں آمد — زہر سو، زدج کبک وسار وقمری نغمہ خواں آمد
بباغ وراغ وکوہ ودر، صبا مستانہ می رقصد — بشاخِ گلستاں، بنگر، عرار وضیمراں آمد
لبِ جو، جامِ مے بر کف، قدح نوشے خرد سوزے — بمستی بیخبراز خویشتن، نعرہ زناں آمد
کتاب وحکمت ودانش، ہمہ را سوخت ایں ساعت — نمی بینی کہ واعظ ہم، سرِ دیرِ مغاں آمد
چہ آتش ہا برافروزد، بہ صحنِ گلشنِ لالہ — جنوں پاکوبد ورقصد، خرد آزردہ جاں آمد
چہ عہدِ پُر نشاط آمد، چہ دورِ انبساط آمد — براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو، شادماں آمد
نسیمِ صبح پرّاں شد، شمیمِ گل شتاباں شد — ہمی گردد سُبکسر ہر کہ ایں جا سرگراں آمد

تاب حیدر آبادی، عبداللہ بن احمد

حیدر آباد کے مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ ۱۷ جون ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام احمد تھا، جس سے یہ ابن احمد کہلائے۔ ان کا متوسط الحال عرب خاندان تھا۔ سقیم حالات کے باعث ابن احمد اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔ مدرسۂ نظامیہ اور کائستھ پاٹھ شالا میں کچھ پڑھا اور پھر کسبِ معاش کے لیے بلدیۂ حیدر آباد میں ملازمت اختیار کر لی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق عنفوانِ شباب سے تھا۔ عمر عزیز مشکل سے ۱۵ برس کی ہوگی کہ شعر کہنے لگے۔ بلکہ اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۳ء میں انھوں نے خود ایک ہفتہ وار اخبار "اردو" جاری کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے محض شوق تو کفالت نہیں کرتا؛ اس کے چلانے کے لیے جتنا روپیہ درکار تھا، وہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ سال بھر کے اندر پرچہ بند ہو گیا۔

ابتدا میں تخلص آوارہ کیا اور حیدر پاشا حیدر سے مشورہ رہا۔ بعد کو دکن کے مشہور استاد بہبود علی صفی، اورنگ آبادی (ف مارچ ۱۹۵۴ء) کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ کلام بھی اچھا تھا اور پڑھتے بھی خوب تھے؛ ان کے ترنم میں سوز کا پہلو نمایاں تھا، جو ان کی زندگی کے ناسازگار ماحول اور ناموافق حالات کا آیینہ دار تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے ہار نہیں مانی، نہ کبھی مایوسی کا اظہار کیا۔ حیدر آباد کے ترقی پسند حلقوں میں انھیں ممتاز مقام حاصل تھا، بلکہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین آندھرا پردیش کی مجلسِ عاملہ کے رکن بھی تھے۔

ان کے کلام کا مختصر انتخاب "خامۂ دل" کے عنوان سے ادبی ٹرسٹ، حیدر آباد نے مئی ۱۹۷۳ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں نظمیں بھی ہیں، اور غزلیں بھی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ

ان کا کلام زندہ رہنے کا مستحق ہے۔ اگر حیات وفا کرتی، تو وہ یقیناً اور بھی ترقی کرتے۔

وفات کے بارے میں دو بیان ہیں پہلا یہ کہ وہ شب بھر کہیں پیتے رہے، ۲۴ نومبر ۱۹۷۳ء علی الصباح نشے میں چور مکان واپس آرہے تھے کہ گھر کے قریب گرے اور جاں بحق ہو گئے۔

دوسرا بیان یہ ہے کہ ۲۴ نومبر ۱۹۷۳ء علی الصباح وہ گھر سے سیر کو باہر نکلے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ قلب پر شدید حملہ ہوا اور پیشتر اس کے کہ کوئی مدد کو پہنچ سکے، جاں بحق ہو گئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا؛ اور اعزّہ اور احباب کے جمِ غفیر نے انھیں درگاہِ حضرت عبداللہ شاہ صاحب کے احاطے کا ماں ٹھیورہ، وود وہ بادلی میں سپردِ خاک کر دیا۔

اولادِ جسمانی میں چار لڑکے اور ایک بیٹی اپنی یادگار چھوڑی۔

یہ احتیاط کا عالم بھی کیا قیامت ہے ۔۔۔ پکار بھی نہ سکے، تجھ کو تیرے نام سے ہم
نہیں نصیب میں نورِ سحر، تو غم بھی نہیں ۔۔۔ مگر چراغ کی صورت جلے ہیں شام سے ہم

محفل کی حد تک، ہوتی ہے بات چراغِ محفل کی
اور چراغِ راہ کے چرچے منزل منزل ہوتے ہیں

کہہ دو ہنسنے والوں سے: ہر خوشی کی حد غم ہے
کوئی رہ نہیں سکتا غم سے بےخبر ہو کر
جب سے دل کی دھڑکن میں، درد ہو گیا شامل
زندگی نظر آئی، اور معتبر ہو کر

حرم کی، دَیر کی راہوں سے ہو کے گزرا ہوں ۔۔۔ تری گلی سے مگر آج تک گزر نہ سکا
حرم کی، دَیر کی راہوں پہ چل تو سکتے ہیں ۔۔۔ مگر نصیب کہاں تیری رہگذار ابھی!

نہ تھی توفیق جن کو، تاب، اپنے زخم دھونے کی
وہ ہاتھ اب بڑھتے بڑھتے دامنِ قاتل تک آپہنچے

بقدرِ نور تو شمعِ شبستان خوب ہے، لیکن ۔۔۔ چراغِ رہگذر کی روشنی کچھ اور ہوتی ہے
بحدِّ گلستاں، گل کا تبسّم دیکھنے والو! ۔۔۔ گلِ دشت آفریدہ کی ہنسی کچھ اور ہوتی ہے
ہمارا دل بھی ہے اک خانۂ خدا، اے شیخ! ۔۔۔ مگر یہ دل کسی دیوار و در کا نام نہیں

حرم سے، دَیر سے کچھ راستے تو ہیں منسوب — یہ راستے تو تری رہگذر کا نام نہیں
مقامِ دوست سے آگے ہے منزلِ غمِ دوست — مقامِ دوست ہی ختمِ سفر کا نام نہیں

راہوں کی دلآویزی اکثر مجبورِ سفر کر دیتی ہے
منزل پہ پہنچ کر بھی کتنے آسودۂ منزل ہو نہ سکے

اشاریہ

۱۔ اشخاص

(کسی ہندسے کے نیچے لکیر سے یہ مراد ہے کہ اس صفحے پر یہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے)

۲ مطبوعات
(کتب و رسائل)

کتابہ : بدیع الرحمٰن قاسمی

۲۸ فروری ۱۹۷۶ء